فہرست مضامین

محرم نمبر ۱۴۲۵ھ

منظومات

اداریہ

ہندوستان میں بہت عرصے سے ایک علمی وتحقیقی مجلہ کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی اور تشنگان علم وعرفان مضطرب سے نظر آرہے تھے اور شاید انکی پریشانی اور اضطراب حق بجانب ہے کیونکہ مدارس دینیہ سے شائع ہونے والے رسائل وجرائد کا معیار علمی اتنا گرتا جارہا ہے کہ ایک مدرسہ، حوزہ یا جامعہ کا ترجمان نہیں کہا جاسکتا اور خصوصاً جب ایک ادب دوست، علم وہنر کا دلدادہ، جو ہر آن، ہرلحہ صرف اسی فکر میں غلطاں ہے کہ کوئی تو ہو جو ایک ایسے چشمۂ آب زلال کی خبر دے، جس سے ہماری تشنگی برطرف ہوسکے۔

تو اسکی جستجو اسی نتیجہ پر منتہی ہوتی ہے کہ چلو ان مجلوں کا مطالعہ کروجو مدارس علمیہ کی ترجمانی کرتے ہیں مگر جب وہ عصر حاضر کے شائع ہونے والے رسالوں کو اپنے لئے درمقصود سمجھتا ہے تو اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایسے ہی کچھ مسائل اور عصر حاضر کے جوانوں کے مذہبی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے مؤسسۂ نور ہدایت نے علمی وفکری ماہنامہ ''شعاع عمل'' شائع کرنے کا فیصلہ کیا جس میں ہمارے موجودہ علماء کرام و دانشمندان عظام کے قلمی شاہکار کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ علمائے ماسبق کے فراموش شدہ علمی کارناموں کو بھی منظر عام پر لایا جائے تا کہ ان کے رشحات قلم سے ہم اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ انکے کلام کی شستگی، اسلوب نگارش، اور اذہان ملت تک حق کا پیغام پہونچانے کے سلیقوں کو اپنا مطمع نظر قرار دیتے ہوئے، اپنے بھائیوں کو ایک مؤثر پیغام پہونچا سکیں۔

الحمدللہ ہمارے مجلہ میں موجودہ حالات کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے اور ہمیشہ یہی کوشش کی جائے گی کہ ایسے مضامین شائع کئے جائیں جن سے قوم وملت کی فلاح وبہبود وابستہ رہے۔ کیونکہ ہمارا ھدف یہ نہیں ہے کہ ہم قوم کو علمی طور پر مرعوب کریں بلکہ اس مجلہ کی اشاعت کے اہم اغراض ومقاصد یہ ہیں کہ ہم اپنی اصلاح کریں، حقیقی مسلمان بننے کی کوشش کریں، ترقی یافتہ دور سے گناہوں کی آلودگی دور کریں اور نور ایمان وعمل سے ہر کوچہ، ہر جادہ کو منور کریں اور اپنے معاشرہ کو حقیقی ترقی یافتہ معاشرہ بنائیں یہی وجہ ہے کہ اس مجلہ کا نام ''شعاع عمل'' قرار پایا۔

مزید یہ کہ اس مجلہ میں قرآن کریم کے مختلف موضوعات سے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لئے الگ سے ایک

باب قائم کیا گیا ہے، جو قرآن شناسی کے عنوان سے ہے۔

خدائے رحیم و کریم سے مزید توفیق کے خواہاں ہیں اور ساتھ ہی ان حضرات کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری ہے جنہوں نے دامے، درمے، سخنے اس مجلہ کی اشاعت میں حصہ لیا۔ ادارہ کے سبھی کارکن اپنے معاونین کے لئے دست بدعا ہیں کہ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آپ کے کاروبار میں بیش از پیش ترقی عنایت فرمائے۔

خدا کی توفیق کے ساتھ ساتھ اگر مومنین کی مالی امداد کا سلسلہ جاری رہا تو انشاء اللہ اس مجلہ میں چار چاند لگائے جا سکتے ہیں۔

آخر میں ارباب فکر و نظر سے التماس ہے کہ مستقل اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہیں تاکہ ادارہ مجلہ کی کمیوں کو دور کر سکے۔

مؤسسۂ نور ہدایت

حسینیۂ حضرت غفران مآبؒ چوک لکھنؤ

(یو۔ پی) ہند

حسینؑ معراجِ انسانیت

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

جس طرح حضرت امام حسنؑ کی ولادت کے متعلق دو قول ہیں ۲ھ ۳ھ اسی اعتبار سے امام حسینؑ کی ولادت کے متعلق دو قول ہیں ۳ھ اور ۴ھ اگر ان کی ولادت ۲ھ میں ہوئی ہے تو ان کی ۳ھ میں ہے اور اگر ان کی ولادت ۳ھ میں ہے تو ان کی ۴ھ میں ولادت ہوئی ہے۔ اس طرح وفات رسولؐ کے وقت ان کا چھٹا یا ساتواں برس تھا۔

اس دور اور اس کے بعد جناب امیرؑ کے دور میں جو کچھ حسن مجتبیٰؑ کے ساتھ رہا وہ حسینؑ کی سیرت کے ساتھ بالکل متحد ہے اس لئے کہ ایک سال کے فرق سے کوئی فرق احساسات، تأثرات اور ان کے مقتضیات میں نہیں ہوتا۔ جن واقعات سے جتنا وہ متاثر ہو سکتے تھے اتنا ہی یہ اثر لے سکتے تھے۔ وفات رسولؐ کے بعد سے پچیس برس کا دور جو امیر المومنینؑ نے گوشہ نشینی میں گذارا وہ جس طرح ان کے لئے ایک دور ابتلاء تھا ان کے لئے بھی تھا۔ جو جو مناظر ان کے سامنے آ رہے تھے وہ ان کے سامنے بھی بلکہ امام حسنؑ کو تو دنیا نے صرف بحیثیت صلح پسند اور حلیم کے پہچانا ہے اس لئے وہ اس دور میں ان کے امتحان کی عظمت کو بآسانی شاید محسوس نہ کرے مگر حسینؑ کو تو دنیا نے روز عاشور کی روشنی میں دیکھا ہے اور بڑا صاحبِ غیرت وحمیت، خوددار گرم مزاج اور اقدام پسند محسوس کیا ہے اس روشنی میں پچیس برس کے دور خاموشی پر نظر ڈالئے ظاہر ہے کہ ان کے شباب کی منزلیں وہی تھیں جو حضرت امام حسنؑ کی تھیں۔ ۲۵ سال کی مدت کے اختتام پر وہ تینتیس برس کے تھے تو یہ بتیس برس کے گویا عمر کے لحاظ سے حسینؑ اس وقت عباسؑ تھے کربلا میں جو ابوالفضل العباس کے شباب کی منزل تھی وہ ۲۵ سال کی گوشہ نشینی کے اختتام پر حسینؑ کے شباب کی منزل تھی۔ اس عمر تک وہ تمام واقعات سامنے آتے ہیں جو اس دور میں پیش آتے رہے اور امام حسینؑ خاموش رہے۔ مصائب وحوادث کے وہ تمام جھونکے آئے اور ان کے سکوت کے سمندر میں تموج پیدا نہ کر سکے۔

ان کے ۲۵ برس حضرت علیؑ کی مکہ کی زندگی کے ۱۳ برس کے موازی ہیں وہ پیغمبرؐ کی خاموشی کے رفیق۔ یہ حضرت علیؑ کی خاموشی کے ہمدم۔ وہ حضرت رسولؐ پر مظالم دیکھ رہے تھے جو ان کے مجازی حیثیت سے باپ کی حیثیت رکھتے تھے اور یہ حضرت علیؑ پر مظالم دیکھ رہے تھے جو ان کے حقیقی حیثیت سے باپ تھے جس طرح وہاں کوئی تاریخ نہیں بتاتی کہ کسی ایک دفعہ بھی علیؑ کو جوش آ گیا ہو اور رسولؐ کو علیؑ کے روکنے کی ضرورت پڑی ہو۔ اسی طرح کوئی روایت نہیں بتاتی کہ اس ۲۵ برس کی طویل مدت میں کبھی

حسینؑ کو جوش آگیا ہو اور حضرت علیؑ نے بیٹے کو روکنے کی ضرورت محسوس فرمائی ہو یا سمجھانے کی کہ یہ نہ کرو۔ اس سے ہمارے مقصد یا اصول کو نقصان پہنچے گا۔

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ جب حضرت علیؑ نے میدان جہاد میں قدم رکھا تو اب جہاں حسنؑ تھے وہیں حسینؑ بھی تھے وہ باپ کے داہنی طرف تو یہ بائیں طرف۔ ہر معرکہ میں عملی حیثیت سے شریک ہیں۔ اس کے بعد جب صلحنامہ لکھا گیا تو جہاں بڑے بھائی کے دستخط ہیں وہیں چھوٹے بھائی کے دستخط۔ جناب امیرؑ کی شہادت کے بعد اسی طرح یہ حضرت امام حسنؑ کے ساتھ ہیں جہاد میں بھی اور صلح میں بھی۔ ابوحنیفہ دینوری نے الاخبار الطوال میں لکھا ہے کہ صلح کے بعد دو شخص امام حسنؑ کے پاس آئے۔ یہ جذباتی قسم کے دوست تھے صحیح معرفت نہ رکھتے تھے انھوں نے سلام کیا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا مُذِلَّ الْمُوْمِنِیْنَ: ''اے مومنوں کو ذلیل کرنے والے آپ پر سلام ہو''

یہ بخیال خود مومنین ہیں جن کا یہ اخلاق ہے اور یہ ان کا بلند اخلاق ہے کہ ایسے الفاظ کے ساتھ جو سلام ہو اس کا بھی جواب دینا لازم سمجھتے ہیں اور نرمی کے ساتھ فرماتے ہیں۔

لَسْتُ مُذِلُّهُمْ بَلْ مُعِزُّهُمْ میں نے مومنین کو ذلیل نہیں کیا بلکہ ان کی عزت رکھ لی اس کے بعد مختصر طور پر انہیں صلح کے مصالح سمجھائے جس پر وہ خاموش سے ہو گئے اور اب وہ اٹھ کر امام حسینؑ کے پاس آئے اور خود ہی یہ واقعہ پیش کیا کہ ہم سے امام حسنؑ سے گفتگو یہ ہوئی ہے۔ آپ نے امام حسنؑ کا جواب سننے کے بعد فرمایا:

صَدَقَ اَبُوْ مُحَمَّدٍ یعنی حضرت امام حسنؑ نے بالکل سچ فرمایا۔ صورت حال یہی تھی اور اس کا تقاضا اسی طرح تھا۔

بعض سورما قسم کے آدمی آئے اور انھوں نے کہا: آپ حسن مجتبیٰؑ کو چھوڑیئے، وہ صلح کے اصول پر برقرار ہیں مگر آپ اٹھئے ہم آپ کے ساتھ ہیں اچانک حکومت شام پر ہلّہ بول دیں۔ امام حسینؑ نے فرمایا: غلط بالکل غلط۔ ہم نے ایک معاہدہ کرلیا ہے اور اب ہم پر اس کا احترام لازم ہے۔ ہاں اسی وقت حضرت نے یہ کہہ دیا کہ تم میں سے ہر ایک کو اس وقت تک بالکل چپ چاپ بیٹھا رہنا چاہئے جب تک یہ شخص یعنی معاویہ زندہ ہے۔ یہ آپ کا تدبر تھا۔ آپ جانتے تھے کہ معاویہ کی طرف سے آخر میں اور شرائط کے ساتھ اس شرط کی خلاف ورزی ہوگی۔ کہ انہیں اپنے بعد کسی کو نامزد نہ کرنا چاہئے۔ اس وقت ہمیں اٹھنے کا موقع ہوگا۔

اب کون کہہ سکتا ہے کہ حسنؑ کی صلح کے بعد حسینؑ کی جنگ کسی پالیسی کی تبدیلی، ندامت و پشیمانی یا اختلاف رائے و مسلک کا نتیجہ تھی؟ ۲۰ سال پہلے کہا جا رہا ہے کہ ہمیں اس وقت تک خاموش رہنا چاہئے جب تک معاویہ زندہ ہے اس سے ظاہر ہے کہ ۲۰ برس کی طویل راہ کے تمام سنگ میل نظر کے سامنے ہیں اور پورا لائحہ عمل پہلے سے بنا ہوا مرتب ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ طویل سکوت بھی اسی معاہدہ کے ماتحت ضروری ہے اور اس وقت کے اقدام کا بھی اسی معاہدہ

کے ماتحت حق ہوگا۔کیا اس کے بعد بھی اس میں کوئی شک ہے کہ حسن مجتبیٰؑ کی صلح حسینؑ بن علیؑ کی جنگ کی ایک تمہیدی تھی ۔اور کچھ نہیں۔

۴۱ھ میں یہ صلح ہوئی اور ۶۰ھ میں معاویہ نے انتقال کیا اس بیس سال کی طولانی مدت میں کیا کیا ناسازگار حالات پیش آئے اور عمال حکومت نے کیا کیا تکلیفیں پہنچائیں مگر ان تمام حالات کے باوجود جس طرح رسولؐ کے ساتھ علیؑ مکہ کی تیرہ برس کی زندگی میں جس طرح حضرت علیؑ کے ساتھ حسن مجتبیٰؑ اور خود حسینؑ ۲۵ برس کی گوشہ نشینی کے دور میں ،اسی طرح حضرت امام حسنؑ کے ساتھ امام حسینؑ دس برس کے ان کے دورِ حیات میں جو صلح کے بعد تھا حالانکہ اس زمانہ کے حالات کو وہ کن عمیق قلبی تاثرات کے ساتھ دیکھتے تھے ان کا اندازہ خود ان کے اس فقرے سے ہوتا ہے جو انہوں نے حضرت امام حسنؑ کے جنازے پر مروان سے کہا تھا۔

جب مروان نے وفاتِ حسنؑ پر اظہار افسوس کیا تو امام حسینؑ نے فرمایا، کہ اب رنج وافسوس کر رہے ہو اور زندگی میں ان کو غم و غصہ کے گھونٹ تم پلاتے تھے جو کہ یاد ہیں مروان نے جواب دیا بیشک! وہ ایسے کے ساتھ تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ متحمل اور پُرسکون تھا۔

یہ تعریف اس وقت مروان امام حسنؑ کی کر رہا تھا جب دنیا سے اٹھ چکے تھے۔مگر کیا اس تعریف میں خود حسینؑ بھی حصہ نہ رکھتے تھے؟ کیا اس طویل مدت میں انہوں نے کوئی جنبش کی جو حسن مجتبیٰؑ کے سکون کے مسلک کے خلاف ہوتی؟ پھر امام حسنؑ کے جنازے کے ساتھ جو ناگوار صورت پیش آئی وہ روضۂ رسولؐ پر دفن سے روکا جانا۔وہ تیروں کا برسایا جانا۔یہاں تک کچھ تیروں کا جسدِ امام حسنؑ تک پہونچنا۔یہ صبر آزما حالات اور ان سب کو امام حسینؑ کا برداشت کرنا۔

کوئی شاید کہے کہ حسینؑ کیا کرتے؟ بے بس تھے مگر کیا کربلا میں حسینؑ کو دیکھنے کے بعد وہ یہ کہنے کا حق رکھتا ہے؟ کربلا میں تو سامنے کم از کم ۳۰ ہزار تھے اور جنازہ حسنؑ پر سدّ راہ ہونے والی جماعت زیادہ سے زیادہ کئی سو ہوگی۔ حسینؑ کے ساتھ عباسؑ بھی موجود ہیں جو اس وقت ۲۲ برس کے مکمل جوان تھے جناب محمد حنفیہ بھی موجود تھے جن کی شجاعت کا تجربہ دنیا کو حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ جمل اور صفین میں ہو چکا تھا۔مسلم بن عقیل بھی موجود تھے جنہیں بعد میں پورے کوفہ کے مقابلہ میں تن تنہا حسینؑ نے بھیج دیا اور انہوں نے اکیلے وہ بے نظیر شجاعت دکھائی جو تاریخ میں یادگار ہے۔

علی اکبرؑ بھی بنا بر قول قوی اس وقت ۱۵ برس کے تھے جو کربلا کے قاسمؑ سے زیادہ عمر رکھتے تھے اور تمام بنی ہاشم موجود تھے۔پھر کچھ تو آل رسولؐ کے وفادار غلام اور دوسرے اعوان و انصار بھی موجود ہی تھے اس صورت حال میں حضرت امام حسینؑ کے عمل کو بے بسی کا نتیجہ سمجھنا کہاں درست ہوسکتا ہے۔

مگر حسینؑ خاموش رہتے ہیں اور ان سب کو خاموشی پر مجبور رکھتے ہیں امام حسنؑ کا جنازہ واپس لے جاتے

ہیں جنت البقیع میں دفن کر دیتے ہیں اور اس کے بعد دس برس حسنی صلح کے مسلک پر خاموشی کے ساتھ گزار دیتے ہیں اور اس طرح یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ بڑے بھائی کا دباؤ یا مروت اور احترام کا تقاضا نہ تھا بلکہ مفاد اسلامی کا لحاظ تھا جس کے وہ بھی محافظ تھے اور اب یہ اس کے محافظ ہیں۔

اور ادھر حکومت شام کی طرف سے اس تمام مدت میں ہر ہر شرط کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔

چُن چُن کے دوستانِ علیؑ کو قتل کیا جا رہا تھا اور جلا وطن کیا جا رہا تھا۔ کیسے کیسے افراد؟ حجر بن عدی اور ان کے ۱۶ ساتھی۔

یہ دمشق کے باہر مرج عذراء میں سولی چڑھا دیئے جاتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ یہ حجر بن عدی فضلائے صحابہ میں سے تھے۔ مسائل فقہیہ میں ان کے فتاویٰ جمع کئے جائیں تو ایک جزو کا رسالہ ہوجائے۔ مگر علیؑ کے دوست تھے اس لئے ان کی صحابیت بھی کام نہ آسکی۔ کوفہ سے قید کر کے دمشق بلوائے گئے۔ حاکم شام نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے پوچھ گچھ یا صفائی پیش کرنے کا موقع بھی دینا پسند نہ کیا۔ حکم ہوگیا کہ بیرونِ شہر ہی روک دیئے جائیں اور وہیں سولی دے دی جائے۔ ان کی شہادت اتنی دردناک تھی کہ عبداللہ بن عمر نے اس کا ذکر سنا تو چیخیں مار کر رونے لگے۔ ام المومنین عائشہ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہا۔

آخر معاویہ خدا کو کیا جواب دے گا، کہ ایسے ایسے نیکوکار مسلمانوں کا خون کر رہا ہے۔

عمرو بن الحمق الخزاعی وہ بزرگوار تھے جنہیں پیغمبرؐ خدا نے غائبانہ طور پر اپنے سلام سے سرفراز کیا تھا ان کا سر کاٹ کر نوک نیزہ پر بلند کیا گیا۔ یہ سب سے پہلا سر تھا جو اسلام میں نیزہ پر بلند ہوا۔

ان حوادث سے عبداللہ بن عمر اور عائشہ بنت ابی بکر ایسے لوگ اس قدر متاثر تھے تو حسینؑ بن علیؑ جن کے والد بزرگوار کی محبت کی پاداش ہی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا جتنا بھی متاثر ہوتے کم تھا۔

پھر حضرت امام حسنؑ کے دس سال تک سکوت اور عدم تعرض کی جو قیمت ان کو ملی یعنی زہر قاتل اور کلیجے کے بہتر ٹکڑے اور پھر ان کی وفات پر دمشق کے قصر سے اظہارِ مسرت میں اللہ اکبر کی بلند آواز۔ ان سب باتوں کے بعد حضرت امام حسینؑ کی خاموشی۔ کیا کسی میں ہمت ہے جو اس وقت کے حسینؑ پر جنگجوئی کا الزام عائد کر سکے؟

اب اس کے بعد وہ ہنگام آیا جسے امام حسینؑ کی آنکھیں بیس برس پہلے دیکھ رہی تھیں یعنی حاکم شام نے اپنے بیٹے یزید کی خلافت کی داغ بیل ڈال دی اور اس کے لئے عالم اسلام کا دورہ کیا۔

اب امام حسینؑ کے لئے وہ شاہراہ سامنے آگئی جو انکارِ بیعت سے شروع ہوئی اور آخر تک انکارِ بیعت ہی کی شکل میں قائم رہی۔

پھر اس انکارِ بیعت کو کیا کوئی وقتی، جذباتی فیصلہ یا ہنگامی جوش کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے؟

یا درکھنا چاہئے کہ انکارِ بیعت تو ابھی تک کبھی قانونی جرم قرار بھی نہ پایا تھا۔ خلافتِ ثلٰثہ میں بہت سوں نے بیعت نہیں کی۔

حضرت علیؑ کے دور میں عبداللہ بن عمر نے بیعت نہیں کی اسامہ بن زید نے بیعت نہیں کی سعد بن ابی وقاص نے بیعت نہیں کی۔ حسان بن ثابت نے بیعت نہیں کی۔ مگر ان بیعت نہ کرنے والوں کو واجب القتل نہیں سمجھا گیا۔

امام حسینؑ نے بیعت نہ کرکے اپنے کو حمایت باطل سے الگ کیا بس۔ اس کے علاوہ کوئی اقدام نہیں کیا۔ مگر معاویہ کے بعد جب یزید برسر اقتدار آیا تو اس نے پہلا ہی حکم اپنے گورنر ولید کو یہ بھیجا کہ حسینؑ سے بیعت لو اور بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کرکے بھیج دو۔ یہ تشدد کا آغاز کدھر سے ہو رہا ہے؟ حاکم مدینہ کو اس حکم کی تعمیل کی ہمت نہ ہوئی تو اسے معزول کیا گیا۔ امام حسینؑ کو اگر تشدد سے کام لینا ہوتا تو آپ ہلاکت معاویہ کی خبر ملتے ہی مدینہ کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیتے جو اس وقت ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ اس کے بعد کم از کم عالم اسلام تقسیم تو ہو ہی جاتا مگر آپ ایسا نہیں کرتے بلکہ جا کر مکہ میں پناہ لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں کسی کی جان لینا نہیں ہے اپنی جان بچانا منظور ہے۔ یہ ''ہم وجودی'' کا عملی پیغام ہے۔

بظاہر اسباب اگر یہاں قیام کا ارادہ مستقل نہ ہوتا تو احرام حج کیوں باندھتے؟ احرام باندھنا خود نیت حج کی دلیل ہے اور نیت کے بعد بلاوجہ حج توڑنا جائز نہیں۔ حضرت امام حسینؑ سے بڑھ کر مسائل شریعت سے کون واقف ہوگا اور یہ ان کا مخالف بھی خیال نہیں کر سکتا کہ وہ جان بوجھ کر حکم شریعت کی معاذ اللہ مخالفت کریں گے اور وہ بھی کب جبکہ حج کو صرف ایک دن باقی ہے۔

وہ جن کا ذوق حج یہ تھا کہ مدینہ سے آ آ کر ۲۵ حج پا پیادہ کر چکے ہیں اب مکہ میں موجود ہوتے ہوئے حج کو عمرہ سے تبدیل فرما دیتے اور مکہ سے روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرز عمل سے خود ظاہر ہے کہ اس کا سبب غیر معمولی اور ہنگامی ہے۔ چنانچہ ہر ایک پوچھ رہا تھا اور بڑی وحشت اور پریشانی کے ساتھ۔ آئیں! آپ اس وقت مکہ چھوڑ رہے ہیں؟

یہ ہر سوال امامؑ کے دل پر ایک نشتر تھا ہر ایک سے کہاں تک بتلاتے۔ کسی کسی سے کہہ دیا کہ نہ نکلتا تو وہیں قتل کر دیا جاتا اور میری وجہ سے حرمت خانۂ کعبہ ضائع ہو جاتی۔

مکہ میں آنا بھی خطرہ کو حتی الامکان ٹالنا تھا اور اب مکہ سے جانا بھی یہی ہے اب آپ کوفہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ جہاں کے لوگوں نے آپ کو اپنی ہدایت دینی اور اصلاح اخلاقی کے لئے دعوت دی ہے مگر بیچ میں فوج حُر آ کر سدّ راہ ہوتی ہے اب آپ پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ اس پوری فوج کو جو پیاسی ہے سیراب کر دیتے ہیں۔ یہ فیاضی بھی جنگجویانہ انداز سے بالکل الگ ہے اس کے بعد وہ موقع آیا کہ نہر پر خیموں کے برپا کرنے کو روکا گیا اس وقت اصحاب کی تیوریوں پر بل تھے مگر امامؑ نے فرمایا کہ مجھے جنگ میں ابتداء کرنا نہیں ہے۔ ریتی ہی پر خیمے برپا کر دو یہ نفس پر جبر اور حلم و تحمل وہ کر رہا ہے جسے بالآخر جان پر کھیل جانا اور اپنا

پورا گھر قربان کر دینا ہے مگر وہ اس وقت ہوگا جب اس کا وقت آئے گا اور یہ اس وقت ہے جب اس کا وقت ہے۔

پھر عمر سعد کربلا میں پہونچتا ہے تو آپ خود اس کے پاس گفتگوئے صلح کے لئے ملاقات کا پیغام بھیجتے ہیں۔ ملاقات ہوتی ہے تو شرطیں ایسی پیش فرماتے ہیں کہ ابن سعد خود اپنے حاکم عبیداللہ بن زیاد کو لکھتا ہے کہ فتنہ و افتراق کی آگ فرو ہوگئی ہے۔ اور امن و سکون میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ حسینؑ ملک چھوڑنے تک کے لئے تیار ہیں اس کے بعد خونریزی کی کوئی وجہ نہیں۔

اب یہ تو فریق مخالف کا عمل ہے کہ اس نے ایسے صلح پسندانہ رویہ کی قدر نہ کی اور صلح کے لئے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا لیکن اس شرط پر حکومت مخالف راضی ہوگئی ہوتی۔ پھر حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی افتاد طبع میں کسی اختلاف کا تصور کرنے والوں کے تصورات کی کیا بنیاد باقی رہ سکتی تھی اور صورت حال کے سمجھنے کے بعد اب بھی یہ تصورات تو غلط ثابت ہو ہی گئے مگر وہ ابن زیاد کی تنگ ظرفی فرعونیت اور یزید کے منشاء کی تکمیل تھی کہ اس نے حضرت امام حسینؑ پر صلح و امن کے سب راستوں کو بند کر دیا۔

پھر بھی جب نویں تاریخ کی سہ پہر کو حملہ ہوگیا تو حضرت نے ایک رات کی مہلت لے لی جسے جنگ کرنا ہی مطلوب تھا وہ التوائے جنگ کی درخواست کیوں کرتا مگر اس ایک رات کی مہلت کو حاصل کر کے بھی آپ نے اپنی امن پسندی کا ثبوت دیا اور دکھلا دیا کہ جنگ تو مجھ پر خواہ مخواہ عائد کی جارہی ہے میں جنگ کا اپنی طرف سے شوق نہیں رکھتا ہوں

پھر صبح عاشور کوئی دقیقہ موعظہ و نصیحت اور اتمام حجت کا اٹھا نہیں رکھا۔ خطبہ جو پڑھا وہ اونٹ پر سوار ہو کر اس لئے کہ وہ ہنگامِ امن کی سواری ہے گھوڑے پر نہیں سوار ہوئے جو جنگ کے ہنگام کا مرکب ہوتا ہے۔

باوجودیکہ خطبہ کے جو جواب ملے وہ دل شکن تھے مگر اس کے بعد بھی آپ نے اس کا انتظار کیا کہ فوج دشمن کی طرف سے ابتدا ہو اور جب پہلا تیر عمر سعد نے چلۂ کمان میں جوڑ کر اپنی فوج سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ کہہ کے لگایا کہ۔ گواہ رہنا پہلا تیر فوج حسینی کی طرف میں رہا کر رہا ہوں۔ اور اس کے بعد چار ہزار تیر کمانوں سے روانہ ہوگئے اور جماعتِ حسینی کی طرف آ گئے۔ اس وقت مجبور ہو کر امامؑ نے اذن جہاد دیا۔ اور اس کے بعد بھی خود اس وقت تک جہاد کے لئے تلوار نیام سے نہیں نکالی جب تک آپ کی ذات میں انحصار نہیں ہوگیا۔ جب تک ایک بھی باقی رہا آپ نے شمشیر زنی نہیں کی۔ اور اس طرح پیغمبرؐ کے کردار کی تفسیر کر دی۔ جب کوئی نہ رہا اس وقت تلوار کھینچی اور یہ ایسا وقت تھا جب کسی دوسرے میں دم نہ ہوتا کہ وہ جنبش بھی کر سکتا تین دن کی بھوک پیاس اور اس پر صبح سے سہ پہر تک کی تمازت آفتاب میں شہداء کے لاشوں پر جانا اور پھر خیمہ گاہ تک پلٹنا اور پھر بہتر کے داغ، عزیزوں کے صدمے اور ان کی لاشوں کا اٹھانا۔

جوان بیٹے کا بصارت لے جانا اور بھائی کا کمر توڑ جانا اور اپنے ہاتھوں پر ایک بے شیر کو دم توڑتے میں

سنبھالنا۔ اور نوک شمشیر سے ابھی ابھی اسکی قبر بنا کر اٹھنا ۔اب اس عالم میں جذبات نفس کا تقاضا تو یہ ہیکہ آدمی خاموشی سے تلواروں کے سامنے اپنا سر بڑھا دے اور خنجر کے آگے گلا رکھ دے مگر حسینؑ اسلامی تعلیم کے محافظ تھے ظلم کے سامنے سپردگی آئین شریعت کے خلاف ہے حسینؑ نے اب فریضۂ وفا کی انجام دہی اور دشمنان خدا کے مقابلہ کے لئے تلوار اٹھائی اور وہ جہاد کیا جس نے بھولی ہوئی دنیا کو حیدرؑ صفدر کی شجاعت یاد دلا دی اور اس طرح دکھا دیا کہ ہمارے اعمال و افعال جذبات نفس اور طبیعت کے تقاضوں کے ماتحت نہیں بلکہ فرائض و واجبات کی تکمیل اور احکام ربّانی کی انجام دہی کے ماتحت ہوتے ہیں ۔ چاہے طبعی تقاضے اس کے کتنے ہی خلاف ہوں۔

یہی انسانیت کی وہ معراج ہے جس کی نشاندہی حضرت امام حسینؑ کے اسلاف کرتے رہے اور وہی آج حسینؑ کے کردار میں انتہائی تابانی کے ساتھ نمایاں ہیں۔

☆☆☆

عزاداری حسین-اور اسلام

آیۃ اللہ العظمیٰ علامہ سید علی حائری اللاہوری صاحب قبلہ طاب ثراہ

تاریخی دنیا میں ایک ایسا ہائلۂ عظیمہ اور حادثۂ جسیمہ گذرا ہے۔جس سے زیادہ مہتم بالشان اور کوئی حادثہ نہیں ہوسکتا یہی وہ ایک حادثہ ہے۔جس سے تقریباً تمام دنیا کے مذاہب کو کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے اس عظیم الشان حادثہ کو جس قدر اسلامی دنیا میں عظمت حاصل ہوئی۔جس سے صغیر وکبیر، برناو پیر آج تک متأثر ہو کر خون کے آنسوں رو رہے ہیں اس میں شک نہیں کہ دنیا میں اور بھی بہت سے واقعات حادث ہوتے رہتے ہیں۔اور زمانہ کی گردش کے ساتھ ساتھ ہوتے رہیں گے۔لیکن کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا ہے۔جس سے تیرہ سو برس تک اس کا اثر اس طرح باقی رہے کہ گویا کل کا واقعہ ہے۔

زمانہ میں بڑے بڑے انقلاب ہوئے کفر وضلالت کے سیاہ بادل گھر گھر کر آئے۔خوفناک آندھیاں اٹھیں۔ظلم وستم کے بادل گرجے، بجلیاں چمکیں، یہ کیوں ہوا؟ سب اسلئے کہ زمانہ سے اس یادگارِ حسینؑ مظلوم کو مٹا دیا جائے۔مگر جس قدر مخالف کوششیں اس بارہ میں کی گئیں۔اتنا ہی بے سود، بیکار اور لغو ثابت ہوئیں۔اور مخالفین سے کچھ بھی نہ ہوسکا۔

آج بارہ سو برس سے زیادہ زمانہ گزر گیا۔اتنے طویل عرصہ میں زمانہ کی زبردست طاقتوں نے اس رسمِ عزاداری کو بیخ وبنیاد سے اکھاڑ پھینکنے اور بند کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔مگر نتیجہ کیا ہوا۔نہ تو وہ خود رہے اور نہ انکا کوئی نام لیوا ہی باقی رہا۔لیکن مظلوم کربلا شہید نینوا علیہ السلام کا ذکر روئے زمینِ شور وشیرین میں اسطرح چمکا جس طرح تمام عالم میں آفتاب کی کرنیں پس یہ وہ غم ہے جس کی اشاعت خدا کو منظور ہے اور کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی ہے۔

یاد رکھو کہ شہداء عظام کے کارناموں میں ایک خاص کشش مقناطیسی ہوتی ہے۔کیونکہ یہ ان کی شہادت اور موت قوم کے حیات کا باعث ہوجاتی ہے۔اسلئے ہر قوم اپنے قومی شہیدوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ان کا خاص احترام کرتی ہے۔انکے کارنامے قومی جوش پیدا کرنے کیلئے خلوت، جلوت اور عام جلسوں میں بیان کئے جاتے ہیں۔اشتہاروں، رسالوں اور کتابوں کے ذریعہ عام ومشتہر کئے جاتے ہیں۔جن سے قوم کو جگانے اور اولوالعزمی پیدا کرنے میں خاص اثر ظاہر ہوتا ہے۔

سب شہدا کے سرور وسردار مظلوم کربلا امام حسین علیہ السلام ہیں جنہوں نے ایسے وقت میں اسلام کو سنبھالا ہے۔جبکہ کشتیٔ اسلام طوفان میں پڑی ہوئی تھی یزید جیسا دشمن اسلام رَاکِبُ الْفُجُوْرِ وَشَارِبُ الْخُمُوْرِ اسلام

اور مسلمانوں کا ناخدا بنا ہوا تھا۔ ایسے وقت میں رسولؐ کا نواسا اٹھا۔ اپنے اہلبیتؑ کو ہمراہ لیا اور کربلا کے لق ودق بیابان میں اپنے اور اپنے اعزا کے خون کو بہا کر اسلام اور اسلام کی طوفانی کشتی کو غرق ہونے سے بچا لیا اور سالکوں کیلئے سفینۂ نجات بن گیا۔ یہ لڑائی کوئی پولیٹکل جنگ نہیں تھی۔ اس میں ملک گیری کا خیال نہیں تھا بلکہ یہ جنگ صرف تحفظ اسلام کیلئے تھی۔ پس پیغمبرؐ اسلام نے اگر اسلام کی بنیاد ڈالی تو حسین علیہ السلام نے اس بنیاد کو دنیا میں قائم اور ثابت کر کے دکھا دیا۔ آپ کی مقدس زندگی آئینہ اسلام ہے۔ ایک مجسم نمونہ ہے کیونکہ آپ کی شہادت سے روحانیت وحق کو فتح مبین حاصل ہوئی ہے۔ اور ضلالت و باطل کو شکستِ عظیم۔ سچ ہے ؎

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
سر دادنہ داد دست دردست یزید
حقّا کہ بنائے لاالٰہ است حسینؑ

فی الوقع دیکھنے میں یہ ایک شعر ہے۔ مگر سمجھنے اور معرفت حاصل کرنے کیلئے کچھ اور ہی ہے۔ لہذا جس طرح اسلام کو پھیلانا اور لوگوں کو اس کی دعوت دینی ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اسی طرح عزاداری امام حسین مظلوم علیہ السلام کی اشاعت کو ضروری اور فرض عین سمجھ لینا چاہیئے کہ یہی وہ ذریعہ ہے جو بغیر کسی محنت بغیر کسی دقت اور بغیر کسی مشکل کے تبلیغ حق کا کام آہستہ آہستہ کرتا رہتا ہے۔ اور مخالف اسلام قوموں میں اسکا اثر ہوتے ہوئے اس قدر مستحکم ہوتا ہے کہ کچھ زمانہ جانے پر وہ قومیں محض اس عزاداری کے تاثرات سے ہی حلقۂ اسلام میں داخل ہو جاتی ہیں۔

دنیا کی بلند ترین ہستی

ذاکر شام غریباں سرکار عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب مجتہد طاب ثراہ

جب سے ابتدائے انسانیت ہوئی اور اشرف المخلوقات نے بزم ہستی میں قدم رکھا اس وقت تک اس خاک دان ہست و بود میں ہزاروں ہی ایسی بلند ہستیاں بزم شہود میں آئیں جن کے اعمال و افعال، اخلاق و عادات خدمت حق اور اطاعت احکام کو خالق نے تمام بلند و پست عالم میں اتنا نمایاں پیش کیا کہ ہزاروں برس گذرنے کے بعد بھی انقلاب زمانہ کی دست درازیوں کی یاد دلوں سے نہ مٹا سکی اور کبھی نہ کبھی بھولنے والوں کے عالم خیال میں ان کی تصویریں اپنے روشن خدوخال کے ساتھ گردش کر ہی جاتی ہیں۔ جن میں علمی جلوہ گاہیں بھی، اور عملی بھی ہیں فکر و خیال کے پر کیف منظر بھی ہیں اور بےنظیر سوج بوجھ کے مرقع، سیاست مدن کی راہنمائیاں بھی ہیں اور ناموس شریعت کی ہدایتیں بھی،

وہ ہستیاں بھی دنیا کی پیش نگاہ ہیں جو محض عالم ظاہری کی حد بندیوں کے اندر قابل تقلید کردار کے مالک تھے اور وہ بھی جو منزل فانی سے آگے بڑھ کر دار باقی کی راہوں کے سالک رہے مگر جس کو دیکھئے اس کے لائحہ عمل کے آئینہ میں یا محض دنیا نظر آتی ہے یا محض دین، صرف سیاست نظر آتی ہے یا شریعت، فقط ظاہر نظر آتا ہے یا باطن، صرف نظر کی بلندیاں ملتی ہیں یا محض عمل کی، لیکن ایسی ہستی عالم معنیٰ میں کمزور نگاہ نے تلاش کی تو کوئی نہ ملی۔ جس کے ایک عمل بدل دینے سے پہلو بدلتے جائیں۔

تصویریں بدلتی جائیں، نقش و نگار بدلتے جائیں پھول ایک ہو مگر خوشبو ہر قسم کی موجود، آئینہ ایک ہو کر مگر ہر تصویر کی جلوہ گاہ، آفتاب ایک ہو کر مگر ہر رنگ کی شعاؤں کا منبع، نقطہ ایک ہو مگر دائرۂ فکر کا مرکز البتہ ایک، حسینؑ اور محض حسینؑ جس کو قدرت نے اپنے جمال بلکہ کمال کا وہ بےنظیر آئینہ بنایا تھا جس نے لباس بشری پہن کر بزم انسانی کو زینت دی اور اخلاق الٰہی سے متصف ہو کر ہر کمال کا منظر پیش کیا۔ وہ حسینؑ نہیں جو صرف شیعوں کے امام بلکہ وہ حسینؑ جو چشم و چراغ عرب، وہ حسینؑ جو آسمان اوج قریش، وہ حسینؑ جو نور نگاہ ہاشم، وہ حسینؑ جو پارۂ قلب محمدؐ عربی۔ سر ورقلب علیؑ، زینت آغوش سیدۂ زنان عالم، منبع امامت، مقصد ذبح عظیم، وہ حسینؑ جس کو خدا نے شہادت کے واسطے چنا، رسولؐ نے اپنے دین کی حفاظت کے واسطے، علیؑ نے اپنی شجاعت کا وارث قرار دیا، ماں نے اپنی عصمت کا مستحق بنایا۔

حسنؑ نے اپنی نیابت کے واسطے چھانٹا۔ عالم اسلام نے امامت کی سند عطا کی۔ یزید نے اپنے مظالم کا مرکز بنایا، تلواروں نے حد برداشت آزما کے دیکھا، نیزوں

نے دل کی گہرائیوں کوٹٹولا، تیروں نے مہمان نوازی آزمائی، پیاس نے تحمل کی حدیں دیکھیں، حد سے بڑھتی ہوئی گرمی نے خنکئ ایمان سے مقابلہ کیا، یزید کے ٹڈی دل لشکر نے ثابت قدمی کا امتحان لیا۔ یہاں تک کہ آخر کربلا کی زمین نے اپنی آغوش تمنا میں لے کر سکون واطمینان کی نیند سلا دیا اور دنیا اس مظہر کمال قدرت کے حالات، اخلاق، کردار، علم و عمل کی بلندی دیکھکر محو جمال ہوگئی۔

یہی وہ ذات ہے جو ہر تفریق سے بلند، ہر حد بندی سے باہر، ہر تقسیم سے بالاتر، تمام قوموں، جماعتوں، ملکوں بلکہ ہر عالم کا نقطۂ نگاہ مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کا امام، بہادری کے اعتبار سے ہر لشکر کا علمدار، سیاست کے اعتبار سے بڑے سے بڑا لیڈر، اخلاق کے لحاظ سے تمام دنیا کا رہبر، کردار کی حیثیت سے حکمت عملی کا معلم، عصمت کے لحاظ سے ہر مذہب کا انسان کامل۔

ہمارے نزدیک یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ امام حسینؑ نے اپنی تمام عمر میں جو قدم بھی اٹھایا وہ حدود دین الٰہی کے اندر اور جو عمل بھی کیا وہ اپنے خالق کے بنائے ہوئے دستور العمل کے مطابق۔ عمل کا مشیت خالق کے مطابق ہونا حسینؑ ہی کا کام تھا اور نتائج کی ذمہ داری کا بار صرف خالق کی قدرت پر تھا مگر عمل کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر نگاہ تلاش کو اپنا مطلوب اس سید وسردار جوانان جنت کی سوانح عمری میں کچھ ایسے بے نظیر انداز سے مل گیا کہ ہر باخبر انسان حسینؑ کے کردار کو اپنی راہ عمل بنانے کے واسطے خوشی سے تیار ہوگیا۔

عالم انسانیت میں یہ شان صرف حسینؑ ہی کی ہے کہ جتنا جتنا زمانہ گذرتا جاتا ہے اتنا ہی اتنا رنگ شہادت نکھرتا جاتا ہے اور حسینؑ کی قربانی میں تازگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ آج سے چند صدی قبل مسلمانوں کے علاوہ کب کسی غیر نے اس مظلوم کے کارناموں سے سبق لینے کی اپنے پیروؤں کو تعلیم دی تھی مگر اب تیرہ سو سال گذرنے کے بعد رنگ شہادت اتنا روشن ہوا کہ ہر مذہب والا، ہر ملت کا پیروکار، ہر قسم کی سیاست کا شیدا اپنی قوم اور اپنی جماعت کے سامنے حسینؑ کی مثال پیش کرنا اپنی تبلیغ کا جزو اعظم سمجھ رہا ہے۔

اگر مناسبت محل اجازت دیتی تو میں بلا مبالغہ سیکڑوں ایسے لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کے نام اور ان کے اقوال پیش کرسکتا تھا جو حسینؑ ابن علیؑ کی تقلید، ان کی پیروی اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی دنیا سے فرمائش کر چکے اور فرمائش کررہے ہیں۔

نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ اتنی گنجائش ہے نیز اس وجہ سے کہ میرا مذکورۂ بالا بیان کم از کم ہندوستان میں تو قابل انکار نہیں۔

کیا دنیا میں کوئی اور بھی ہستی ایسی پیش کی جاسکتی ہے جو یوں تمام اقوام عالم اور مذاہب عالم کے واسطے راہبر بن سکی ہو۔

نہیں ہرگز نہیں۔ یہ حسینؑ ہیں صرف حسینؑ جن کے مصائب کی یاد تازہ کرنے کا زمانہ محرم ہے اور اسی ماہ محرم سے سن ہجری کی ابتدا ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ دنیا کے انصاف پسند حسینؑ اور ان کے ماننے والوں کو ہرگز نہ بھولیں گے جو سب کے سب مظلوم کے فدائی اور ظالم کے دشمن ہیں۔

☆☆☆

مجالسِ عزا اور سیرت سازی

صفوۃ العلماء پروفیسر مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ رحمت مآب

خداوند عالم نے انسان کی ہدایت کیلئے انبیاء ومرسلین کا سلسلہ قائم کیا۔ کتابیں نازل فرمائی۔ شریعتیں بھیجیں جن میں سب سے آخر اور کامل ترین شریعت وہ ہے جس کو خاتم النبین حضرت محمد مصطفیٰؐ کے ذریعہ سے بھیجا گیا۔ دور اور زمانہ کے لحاظ سے شریعتیں بدلتی گئیں۔ دین ایک ہی رہا۔ جیسا کہ ارشاد ہے ''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ'' اللہ کے نزدیک دین بس اسلام ہی ہے۔ جناب ابراہیمؑ اور جناب یعقوبؑ کے متعلق یہ تصریح ہے کہ آپ نے اپنی اولادوں سے یہ وصیت فرمائی کہ تمہیں اسلام پر موت آئے۔ تو معلوم ہوا کہ رسالت مآبؐ سے پہلے بھی جس دین کی تبلیغ کی جاتی رہی ہے وہ اسلام ہی تھا۔ شریعتوں کی تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے فروعی احکام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ خود شریعتوں کا بدلنا اس بات کی دلیل ہے کہ خداوند عالم کے احکام میں اغراض ومقاصد پیش نظر ہوتے ہیں۔ اگر اغراض ومقاصد کے پیش نظر شریعت کے احکام نہ ہوتے تو زمانے کے بدلنے سے۔ حالات کی تبدیلی سے شریعت کی تبدیلی کے کوئی معنی نہیں ہوتے خود شریعتوں کا بدلنا اس نظریے کو باطل قرار دیتا ہے جس میں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کے احکام اغراض اور مقاصد کے پیش نظر نہیں ہوتے۔ حقیقت میں کوئی اچھائی اور برائی نہیں ہے جسکا لحاظ کر کے اللہ نے کسی بات کا حکم دیا ہو یا منع کیا ہو بلکہ وہی اچھا ہے جو اللہ کہدے اور وہ برا ہے جسکی اللہ ممانعت کر دے اگر وہ جھوٹ کو واجب کر دیتا تو جھوٹ اچھا ہوتا اور اگر سچ کو منع کر دیتا تو سچ برا ہوتا۔ یعنی اچھائی اور برائی کی بنیاد اللہ کا حکم اور اس کی ممانعت ہے۔ اس کو قطع نظر کرتے ہوئے واقعہ میں نہ کوئی چیز اچھی ہے نہ کوئی چیز بری۔ لیکن اگر یہ نظریہ درست ہو تو پھر خود احکام کے تبدیلی کی بنیاد کیا قرار پاتی ہے۔ حالات وواقعات کے بدلنے سے احکام میں کیوں تبدیلی کی گئی۔ قرآن مجید بھی تصریح کر رہا ہے کہ خداوند عالم کے احکام بے مقصد نہیں ہوتے۔ جیسا کہ روزے کے بارے میں ارشاد ہے کہ روزہ اسلئے تم پر فرض کیا گیا ''لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ'' کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔ نماز کیلئے ارشاد ہے ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ'' نماز ہر طرح کی کھلی اور چھپی برائیوں سے روکتی ہے۔ نماز جماعت کی غرض وغایت یہی قرار دی جاتی ہے کہ مسلمانوں میں اجتماعیت پیدا ہو حج کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ تمام عالم اسلامی ایک مرکز پر متحد ہو۔ ائمہ اہلبیت علیہم السلام سے بھی باکثرت ایسی روایتیں وارد ہیں جن میں شرعی احکام کے اغراض ومقاصد کو بیان فرمایا گیا ہے۔

یقیناً احکام الٰہی کی پابندی سے اجر وثواب اخروی

حاصل ہوگا لیکن یہ ثواب اطاعت کا ہے۔ چونکہ بندہ مومن نے احکام الٰہی کی پابندی کی اس کا ثواب اللہ آخرت میں دے گا جو مختلف عبادتوں کے لئے الگ الگ معین ہے لیکن نگاہ قدرت نے ان احکام کی غرض اخروی ثواب نہیں بلکہ اس نے جو حکم دیئے ہیں وہ انسان کی دنیاوی زندگی کے منافع ومصالح کا لحاظ رکھتے ہوئے دیئے ہیں۔

لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ واقعات کربلا اور مجالس عزاء سے سبق لے کر انسان کو اپنی زندگی سنوارنا چاہئے۔ اپنے اخلاق و کردار درست کرنا چاہئے ،شہدائے کربلا کی سیرت کو اپنانے کی کوشش کرنا چاہئے تو اس کو کوئی نئی بات اور نیا تخیل نہ سمجھنا چاہئے۔ اہلبیتؑ کی روایات موجود ہیں ''مَنْ جَلَسَ مَجْلِساً یُحییٰ فِیْهِ ذِکْرُنَا لَمْ یَمُتْ قَلْبُهٗ یَوْمَ تَمُوْتُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ'' جو شخص کسی ایسی مجلس میں بیٹھے جس میں ہمارا ذکر زندہ کیا جائے تو اس کا دل اس دن جب تمام دل مردہ ہوں گے (یعنی قیامت کے دن) مردہ نہ ہوگا۔

جن احادیث میں فضائل گریہ بیان کیے گئے ہیں ان سے انکار نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ تمام ثواب تو نتیجۂ اطاعت حکم امام میں ملیں گے۔ معصومؑ نے ذکر واقعات کربلا اور مصائب امام حسینؑ پر حکم ہی کیوں فرمایا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا کہ شریعت کے حکم کا مقصد ثواب اخروی نہیں ہوسکتا (کیوں کہ یہ نتیجۂ اطاعت ہے) اب وہ مقصد کیا ہے جس کے پیش نظر یہ حکم دیئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ جب کربلا کے واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں تو ان سے ہمیں ایسے سبق ملتے ہیں جن سے ہم اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں ،اپنے اخلاق و کردار کو اس سانچے میں ڈھال سکتے ہیں جو ایک سچے مومن اور مسلمان کا ہونا چاہئے۔ کبھی کبھی یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ اہلبیتؑ تو معصوم تھے۔ امام حسینؑ تو امام تھے، ہم معصوم یا امام تو نہیں۔ ان کی پیروی کیونکر کرسکتے ہیں۔ لیکن قرآن کی تصریح ہے خدا کسی کے اوپر اتنا بوجھ نہیں ڈالتا جو اس کی برداشت سے باہر ہو۔ اگر معصومین کی پیروی غیر معصوم کے لئے ممکن نہ ہوتی تو اللہ کبھی تمام مسلمانوں کو اتباع رسولؐ کا حکم نہ دیتا پھر کربلا کے آئینے میں تو معصوم کے کردار کے علاوہ کچھ غیر معصوم افراد کی زندگیاں بھی ہمارے سامنے مشعلِ راہ بن کر آتی ہیں۔ کیا کسی نے بھی جناب حبیب ابن مظاہرؓ، جناب مسلم ابن عوسجہؓ اور جناب زہیر قینؓ وغیرہ کے متعلق عصمت کا دعویٰ کیا ہے۔ امام حسینؑ کے ساتھ آنے والوں میں صرف ہاشمی و مطلبی ہی نہیں ،صرف قریشی ہی نہیں ،صرف عرب ہی نہیں بلکہ روم و حبش کے رہنے والے بھی شامل تھے۔ تقریباً ہر سن کے جوان، بوڑھے اور بچے موجود تھے۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی دیکھئے وہ ایک بے مثال اور لاجواب نمونۂ عمل قرار پانے کے قابل ہے۔ کیا بلند اور اہم مقصد کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کردینے کی مثال واقعۂ کربلا سے بڑھ کر ملتی ہے؟ کیا اللہ کی عبادت کو کسی حال میں ترک نہ کرنے کا نمونہ یہاں سے بہتر حاصل کیا جاسکتا ہے؟ کیا آپس میں اخوت و ہمدردی ومواسات کا جذبہ اس سے زیادہ کامل ڈھونڈا جاسکتا ہے؟ کیا سچائی پر جم جانے اور صداقت سے سرمو قدم نہ ہٹنے کی مثال یہاں سے

بہتر کہیں پائی جا سکتی ہے؟ کیا ایثار و قربانی کے کربلا سے بہتر نمونے کہیں ملیں گے؟ کیا بڑی سے بڑی مصیبت کر برداشت اور صبر و استقلال میں فرق نہ آنے کا کربلا سے بڑھ کر کوئی واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے؟ کیا امام کی اطاعت اور فرمانبرداری کو ہر شئے پر مقدم کر دینے کی مثال یہاں سے بڑھ کر کہیں مل سکتی ہے؟ غرض کربلا کی ایک تصویر ہے مگر ہزاروں رنگ نمایاں ہیں۔

کربلا ایک پھول نہیں گلدستہ ہے، گلدستہ نہیں ایک چمن ہے جس میں اخلاق و کردار کے گلہائے رنگارنگ کے مختلف تختے کھلے ہیں اور ہر ایک اپنے رنگ و بر میں لاجواب و بے مثال ہے۔ یہ تصور بالکل غلط ہے کہ امام حسینؑ ہمارے لئے نجات کا وسیلہ قرار پاتے ہیں جیسے عیسائی جناب عیسیٰؑ کے متعلق فدیہ کا تصور رکھتے ہیں۔ یعنی ہم دعویٰ محبت امام حسینؑ کے بعد بالکل آزاد کر دیئے گئے ہیں جو چاہیں بداخلاقی کریں، دوسروں پر ظلم کریں، اس کے حقوق غصب کریں، احکام اسلامی کو پیروں سے روندیں لیکن جنت کا ٹھیکا ہمارے نام لکھ دیا گیا ہے۔ یقیناً امام حسینؑ ذریعۂ نجات ہیں، یقینا امام حسینؑ وسیلۂ بخشش ہیں مگر کس طرح؟ اسی طرح جس طرح حُر کو جہنم سے نجات دے کر جنت کا مستحق بنا دیا۔ یعنی زبانی دعویٰ محبت نہ کرو بلکہ عمل و کردار سے بھی حسینی بننے کی کوشش کرو۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم نے مجالس عزاء کو صرف رسمی چیز بنا لیا ہے۔ ہمارے باپ دادا مجلس کرتے تھے لہٰذا ہمیں مجلس کرنا ہے جو حصہ دس بیس برس پہلے بٹتا تھا وہی بٹنا ہے اگر حصے میں کوئی کمی آ گئی تو دنیا کو منھ کیا دکھائیں گے۔ دوستوں میں ناک کٹ جائے گی تو اب مجلس کیا ہوئی؟ دوستوں میں ناک بچانے کا ذریعہ اور منھ دکھانے کا وسیلہ رہ گئی ہے۔ صبح سے شام تک ایک کے بعد ایک مجلس میں شرکت ہوتی ہے لیکن نہ یہ مقصد لے کر جاتے ہیں کہ کچھ حاصل کرنا ہے اور نہ کچھ تعلیم لے کر اٹھتے ہیں لیکن وہی لوگ جو ماتم کر کے نکل رہے ہیں، جنھوں نے اپنی زبانوں سے ابھی تھوڑی دیر پہلے امام حسینؑ اور شہدائے کربلا کے پاک و پاکیزہ نام لئے تھے جب ان کی گلیوں اور کوچوں میں گفتگو سنی جاتی ہے تو شرم و ندامت سے سر جھک جاتا ہے۔ ہماری قوم اخلاقی اعتبار سے روز بروز گرتی چلی جا رہی ہے حالانکہ ذکر حسینؑ سننے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ میرے خیال میں تمام امراض کا واحد علاج یہ ہے کہ حضرات ذاکرین مجالس کو اہلبیتؑ کے اخلاق و کردار کی درسگاہ بنا دیں اور شرکاء بھی مجلسوں میں صرف سننے، واہ واہ، سبحان اللہ کے نعرہ بلند کرنے اور دوسرے کان سے اڑا دینے کی نیت سے نہیں بلکہ مجلس سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے اٹھیں۔ یقینا شہادت حسینؑ نے ہمیں تبلیغ کا ایک بہترین وسیلہ دیا ہے جو کسی قوم کو حاصل نہیں اور وہ ہماری مجلسیں ہیں۔ بس ضرورت اتنی ہے کہ اس وسیلہ اور ذریعہ کا صحیح مصرف کیا جائے۔ تلوار جتنی جوہر دار اور تیز ہوگی غلط استعمال سے برے نتائج نکلنے کا اتنا ہی زیادہ امکان ہوگا۔ لہٰذا اس ذریعۂ تبلیغ کو بھی غلط ہاتھوں میں جانے سے بچانا چاہئے ورنہ بجائے مفید نتائج برآمد ہونے کے برے نتائج حاصل ہوتے چلے جائیں گے۔

☆☆☆

نجات دہندہ امت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حسینؑ

آپ کی عظیم قربانی شریعتِ اسلامیہ کا احیاء ہے

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

رسول کی آنکھیں بند ہونا تھیں ۔کہ اسلام پر مصائب کا ہجوم ہوگیا۔اس کے روحانی خصوصیات اور اصلی خط وخال بگاڑے جانے لگے۔اسکے احکام میں تغیر وتبدل اور اسکے رسوم وقوانین میں کانٹ چھانٹ کی جانے لگی۔حقیقی جانشین رسول کہ جو ان کے تعلیمات کا عملی نمونہ اور مکمل نقشہ تھا۔وہ گمنامی وانزداء کے پردۂ غیبت میں مستور ہونے پر مجبور ہوا۔اور کار فرمایان تختِ اسلامی نے مصالح وقت اور سیاستِ حاضرہ کی علمبرداری اختیار کر کے اسلام نہیں، بلکہ مسلمانوں کے ظاہری جاہ وحشم کی فراوانی کو مقدم قرار دیا۔یہ سب کچھ ہوا۔لیکن قانون اسلامی کا ظاہری احترام اور شریعت کی رسمی پابندی اور احکام شریعہ کا پاس ولحاظ انتہائی سختی کے ساتھ جاری تھا۔ اور اسلئے ان اشخاص کیلئے جو اسلامی تعلیمات سے صحیح طور پر اثر پزیر ہوں۔ان پر مذہب ہی پر قائم رہنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔نیز پابندیٔ شریعت کے بلند بانگ دعویٰ سے فائدہ اٹھا کر حقیقی رہنمائے اسلام کو پردہ ہی پردہ میں رہ کر ذمہ داران سلطنت سے مفادِ اسلامی کے تحفظ اور احکام شرعیہ کے اجرا کرانے کا بھی موقع مل جایا کرتا تھا۔جس کے نظائر وامثال سے تاریخ کے اوراق مملو ہیں کہ کس طرح بیشمار مواقع پر امیر المومنینؑ نے غلطیوں پر متنبہ کیا، جاتی ہوئی جانوں کو بچایا اور مظلوموں کی امداد کی اور پامال ہوتے ہوئے احکام شریعت کی حفاظت میں کامیاب ہوئے۔

یہ نتیجہ کس بات کا تھا،صرف اسکا کہ اسلامی تختِ حکومت کی جانب سے اسلامی شریعت کی پابندی طرہ امتیاز اور سرمایۂ افتخار سمجھی جاتی تھی اور اس کی کھلم کھلا مخالفت آئینِ قانون کے تحت میں جائز قرار نہ دے دی گئی تھی۔ عام افراد امت سے بھی شریعت کی پابندی قانونی حیثیت سے لازم تھی۔ بلکہ سلطنت کا قانون شرع ہی کے نام سے رائج تھا۔اگر چہ پردہ، پردہ میں اسکے اندر تراش خراش کردی گئی ہو۔

بیشک یہ صورتِ حال ایسی تھی۔کہ جس کی بدولت دنیا میں اسلام اور اس کی شریعت کا نام باقی رہے۔ اور چاہے اس کا اصلی جواہر روحانیت مفقود ہو جائے۔لیکن اسکے نقش سے صفحۂ ہستی سادہ نہ ہونے پائے۔لیکن افسوس ہے کہ یہ صورت بھی باقی نہیں رہی۔ زمانہ کی آفتاد نظام تدریج کی پابند ہے۔ اور ہر چیز ابتدا میں کم اور انتہا میں زیادہ ہوتی

ہے۔روز وشب کی آمد ورفت اور زمانہ کا امتداد سابق کے ہر نقش کو زیادہ مدہم کرتا جاتا ہے اور شورش انگریزی ومفسدہ خیزی کی آگ کو ہوا دیتا ہے۔ بیشک اسلامی آئینہ پر اگر اس دور میں صرف غبار آیا تھا۔ تو کچھ عرصے کے بعد وہ غبار جم گیا۔اور تیسرے دور میں اس نے زنگ کی صورت اختیار کی اور آئینہ کے صفا وضیا کو مفقود ہی کر دیا۔

اس زمانہ میں مخالفت شریعت کی آگ اگر سلگی تھی تو پھر وہ دہکی اور آخر میں شعلہ اٹھنے لگے۔اسلامی مملکت میں بنی امیہ کا دور دورہ ہوا۔اور رسولؐ اسلام کا سرمایۂ زندگی ان خون کے پیاسے دشمنوں تک پہونچایا کہ جو اپنے اقتدار وطاقت کے آخری رمق حیات تک اسی سرمایہ کے تباہ کرنے کیلئے جنگ کرتے رہے تھے۔اور آخر تمام قوتیں ختم ہوجانے کے بعد بیکس وبے بس ہوکر سر تسلیم خم کیا تھا۔ اب آج حالات کی دستیاری اور قسمت کی یاوری نے انہی کو اس سرمایہ کا نگراں ومتولی بلکہ مالک وخداوند بنا دیا ہے۔ پس پھر کیا تھا۔ وہ تلواریں کہ جو بدر واحد وخندق میں کھینچ کر کند ثابت ہوئی تھیں۔اور آخر ناکام ہوکر فتح مکہ میں ایک طویل عرصہ تک کیلئے ہزاروں مجبوریوں کے ساتھ نیام میں چلی گئی تھیں۔اب دوسرے لباس میں نیام سے باہر نکل آئیں۔ اور بیدردی سے احکام اسلامی کا گلا کاٹا جانے لگا۔اس وقت پردہ تھا اور نہ کوئی حجاب،علانیہ شریعت کی مخالفت ہوتی تھی۔ اور اسپر ناز تھا۔ اسلام کو پامال کیا جاتا تھا۔اور اس پر فخر تھا۔ اسلامی رہنماؤں کی زبانوں پر پہرے بیٹھے تھے۔اور دہنوں میں قفل لگے ہوئے تھے۔اور اگر وہ ان تمام موانع کے باوجود رہنمائی کے فرض کو انجام دیتے بھی تو بیکار اس لئے کہ دوسری طرف والوں پر قفل تھے۔

بے ساز وسامان ہدایت،مظلومی وبے بسی کے ساتھ ہدایت،حجاب خفا میں مخفی رہ کر ہدایت،جس کا سلسلہ پہلے دور میں جس کا حوالہ سابق میں گذر چکا، جاری تھا۔ وہ اس زمانہ میں ناممکن تھی اسلئے کہ اب تو احکام شریعت کا زبانی بھی پاس ولحاظ نہ تھا۔ بلکہ اسلام وشریعت اسلام کی مخالفت میں طاقت واقتدار کا مظاہرہ تھا۔اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ

عوام کے خلاق وحالات پر بالادست طاقتوں کا بجلی کی روک سے زیادہ تیز اثر پڑتا ہے۔حکام وقت کے احکام مذہب سے مخالفت بلکہ اعلان جنگ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام عالمِ اسلامی میں مذہب کی طرف سے بےتوجہی اور احکام مذہبی میں تساہل وبے اعتنائی اور معارف صحیحہ سے بےخبری وبے تعلقی کا دور دورہ ہوجائے۔اور مسلمان اسلام سے ہزاروں اور لاکھوں کوس دور جا پڑیں۔ جسکا لازمی نتیجہ ہلاکت ابدی ہے۔اور چونکہ اخلاف اسلاف کے قدم بقدم ہوتے ہیں۔خشت اول کے کج ہو جانے کے بعد ستارہ ثریا تک دیوار کج ہی ہوجائے گی۔ اسلئے ایک عصر میں اسلام کی فنا اور افراد اسلام کی ہلاکت قیامت تک کیلئے امت رسالت مآب کی ہلاکت کے مترادف ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام کی حیات وموت کا سوال درپیش تھا۔اور امت اسلامیہ کے افراد کی قیامت تک کیلئے ہلاکت کا مرقع سامنے آ گیا تھا۔اور امت محمدیہ تیزی کے ساتھ

آتش جہنم کی طرف قدم بڑھاتی تھی بے شک ضرورت تھی اس وقت ایک نجات دہندہ کی، ایک ایسے شخص کو جو امت رسولؐ کو آتش جہنم سے چھٹکارہ دے۔ اور ہلاکت کے خوفناک سمندر میں غرق ہونے سے بچالے۔

اس ضرورت کا احساس کیا حقیقی رہنمائے اسلام حسین ابن علیؑ نے، حسینؑ اس بات کا بیڑا اٹھا کر اٹھے۔ کہ جان جائے مگر امتِ رسولؐ کو عذاب الٰہی سے نجات دیدوں۔ اسلام کو زندہ کروں۔ اور مسلمانوں کو ہلاکتِ ابدی سے بچاؤں۔

انھوں نے اس مقصد کیلئے دنیا کے عظیم ترین مصائب کو برداشت کر کے کربلا کے دل دوز مرقع کو اپنے اور اپنے اعزا واقارب کے خون سے ہمیشہ کے لئے رنگین کر دیا۔ اور تاریخ عالم کے ورق کو اپنی مظلومیت کے تذکرہ سے قیامت تک کو مرقع ماتم بنا گئے۔

انھوں نے یہ سب کس کے لئے کیا، ہمارے لئے، لیکن کن معنی سے؟ اس معنی سے کہ وہ اپنی اس عظیم قربانی کے ذریعہ سے شریعت اسلامیہ کا احیاء کر رہے تھے اور احکام شریعت کی تجدید ظلم واستبداد کی طاقتوں کو جو اسلام کی مٹانے والی تھی۔ فنا کر رہے تھے۔ اور احساسات اسلامی کو بیدار اور اسطرح وہ ہمیشہ کیلئے ایک قوم کی تشکیل کر رہے تھے۔ یعنی حیات ثانیہ دے رہے تھے۔ کہ جو نجات کی مستحق اور جنت میں جانے کے لائق ہو۔ اور شریعت اسلامیہ کی پابندی اور احکام مذہبی کی نگہداشت کا باعث، حقیقی طور پر امت مرحومہ کہنے کے قابل ہو۔ اسی اعتبار سے حسینؑ نجات دہندۂ امت تھے۔ اور اسی معنٰی سے یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ ہمارے لئے شہید ہوئے انکا مقصد یہ تھا کہ افراد اسلام سچے معنی میں مسلمان اور تعلیمات اسلام کا مکمل آئینہ اور پابندیٔ احکام شریعت اور اطاعت الٰہی کا نمونہ بن جائیں۔ ان کے نجات دہندہ ہونے کا کوئی ایسا مفہوم قرار دینا درست نہیں جو ان کے مقصد کو پامال کر دے اور افراد ملت میں پابندی احکام شریعت کے جذبہ کو فنا کی حد تک پہونچائے۔

☆☆☆

کیا رونا بدعت ہے؟

آیۃ اللہ سید باقر نقوی دام ظلہٗ دبئی

ملتوں اور قوموں کا ایک نیا سال اور اس کا پہلا دن ہوا کرتا ہے اور اس نئے دن کو روزِ عید کا نام دیا جاتا ہے ،اس نوروز کا افتتاح خوشیوں ،شادمانیوں اور اس کا استقبال نت نئی رنگ رلیوں سے ہوتا ہے۔

کیا مسلمانوں کا نیا سال بھی اسی آن بان سے آتا ہے؟نہیں اور بالکل نہیں۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ سنہ ہجری کا آغاز محرم سے ہوتا ہے۔ہوسکتا ہے ۶۱ھ سے پہلے یہ مہینہ خوشی اور انبساط کو اپنے ساتھ لاتا ہو مجھے انکار نہیں، مگر ۶۱ھ سے سال نو کا نیا دن ،رنج و غم ،آہ و فغاں ،نالہ و شیون اور واویلاہ کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔

بجائے شادمانیوں کے واحسینا واحسینا کی فلک شگاف صداؤں سے ہلال محرم کا استقبال کیا جاتا ہے۔

وہ داستان غم جس کی ابتدا وفات رسولؐ سے ہم گریباں اور خاتمہ دس محرم کو ہوا، جب رسولؐ کے چھوٹے نواسے حسینؑ کو ان کے بہتر ساتھیوں سمیت وحشیانہ طریقہ پر شہید کر ڈالا گیا ،صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ حق پرست اور حقیقت شناس، ہر انسان اس کی یاد سال بہ سال مناتا ہے۔

کوئی سنگ دل اور پتھر جگر جو حسینؑ کی اس فاجعہ غم کو سنے اور پھوٹ نہ پڑے ،تاثر ایک فطری جذبہ ہے جس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ،رونا آدم زاد انسانوں کی فطرت میں داخل ہے، رقت قلب اور رحم دلی ہی تو نوع بشر اور فرشتوں کے درمیان امتیاز کا سبب بنی ہے۔انبیاء و مرسلین نے آہ و زاری، گریہ و بکا کو چہرۂ بشریت کا غازہ بنایا۔رونا بے صبری ہے یا بزدلی، جائز ہے یا ناجائز ،روا ہے یا ناروا، ہمیں نہیں معلوم تو نہ سہی، مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ قرآن رونے والوں کے تذکرہ سے بھرا ہوا ہے۔

کہیں رونے والوں کا ذکر خیر ہے "وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ" کہیں باپ کا بیٹے کے غم میں روتے روتے نابینا ہوجانے کا تذکرہ ہے۔"وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ وَهُوَ كَظِيْمٌ" حضرت آدمؑ نے فراق جنت یا ترک اولیٰ پر اشکوں کے چشمے بہائے ۔حضرت یعقوبؑ نے فراق یوسفؑ میں چالیس سال روکر ظاہری بصارت کھو دی ،جناب ایوبؑ مصائب پر روتے رہے مگر گلہ نہیں کیا، یحییٰؑ نے آنسوؤں سے زمین صحرا تر کرکے رحمت خدا حاصل کی ،جناب عیسیٰؑ نے زمین گیر اپاہجوں، محتاجوں کی حالت زار پر گریہ کرکے مسیحائی پائی۔

اور خود ہمارے رسولؐ جو تمام انبیاء سے افضل ہونے کے باوجود، کبھی ترس خدا سے روئے، کبھی امت کے لئے روئے، کبھی اپنے چچا حمزہؓ پر گریہ فرمایا اور کبھی اپنے بیٹے

ابراہیمؑ کی وفات پر آنسو بہائے ،اس کے علاوہ کسی مومن کو خستہ حال دیکھا آبدیدہ ہو گئے، کسی صحابی کو کرب و بے چینی میں پایا رو دیئے۔

انس سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ رسولؐ کے ساتھ آپ کے فرزند ابراہیمؑ کے پاس گیا۔ رسولؐ نے ابراہیمؑ کو گلے سے لگایا، پیار کیا۔ پھر دوبارہ اپنے فرزند کے پاس تشریف لے گئے جب نزع کا عالم تھا یہ دیکھکر رسولؐ کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے ۔عبدالرحمٰن ابن عوف نے عرض کیا ''یارسولؐ اللہ آپ رو رہے ہیں'' فرمایا ''آنکھ روتی ہے، دل محزون ہوتا ہے مگر ہم کوئی کلمہ زبان سے ایسا نہیں نکالتے جو مرضیٔ الٰہی کے خلاف ہو۔''

زبیر سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ اپنے فرزند کی لاش لے کر پیدل تشریف لے گئے اور قبر کے قریب بیٹھ گئے، لاش کو قبر میں اتارا اور بغیر آخری دیدار کئے دفن کر دیا، مگر رسولؐ اللہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔صحابہ نے دیکھا تو سب نے رونا شروع کر دیا اور بعض نے کہا کہ یارسولؐ اللہ آپ رو رہے ہیں حالانکہ آپ نے ہمیں رونے سے منع فرمایا ہے ۔فرمایا آنکھ روتی ہے، دل غمگین ہوتا ہے مگر ہم کوئی کلمہ منھ سے ایسا نہیں نکالتے جو رضائے ایزدی کے خلاف ہو۔صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے اپنی مادر گرامی کی قبر کی زیارت فرمائی اور اس طرح گریہ فرمایا کہ اسے دیکھکر تمام اصحاب جو آپ کے ہمراہ تھے رونے لگے۔ اسامہ ابن زید سے روایت ہے کہ امامہ بنت زینب کا جب آخری وقت تھا تو رسولؐ اللہ تشریف لائے اور فرمایا جو چیز لے لی جائے وہ بھی اللہ کی ہے اور جو دیدی جائے وہ بھی اسی کی ہے اور اس کے بعد آپ روئے۔ابن عبادہ نے کہا کہ یارسولؐ اللہ آپ رو رہے ہیں اور ہم کو رونے سے منع فرماتے ہیں، رسالتمآب نے فرمایا ''رونا رحم دلی اور رقت قلب کی علامت ہے جو خدا نے اپنے بندوں کے دل میں قرار دیا ہے اور اللہ اپنے بندوں میں انہیں پر رحم فرماتا ہے جو رحم دل ہو۔'' ابن عبادہ کسی مرض میں مبتلا ہوئے جناب رسالتمآبؐ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے ،وہ غش میں پڑے ہوئے تھے، رسالتمآبؐ نے دریافت فرمایا کہ کیا سعد کا انتقال ہو گیا ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں مرض کی شدت ہے ،حضرتؐ نے رونا شروع کر دیا حضرتؐ کو دیکھکر تمام اصحاب رونے لگے، حضرت نے فرمایا کہ اللہ آنکھوں سے آنسو نکلنے یا قلب محزوں ہونے پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا بلکہ اس زبان سے جو کلمات نکلیں گے اس کی وجہ سے عذاب یا رحم فرمائے گا۔

قرآن اور سنت سے یہ پتا چلا کہ رونا نہ بے صبری ہے نہ بزدلی اور نہ مطلق رونا، ناروا، بلکہ رونا شرافتِ بشر کی علامت، اب جو روایتوں میں بعض جگہ پر رونے سے منع کرنے اور رسالتمآبؐ کے رونے کا تذکرہ ہے۔اس کا یہ مطلب ہے کہ رسولؐ نے اس قسم کے غم منانے اور گریہ وزاری سے روکا ہے جہاں انسان صبر کا دامن ہاتھ سے دیدے، قضاوقدر خداوندی پر راضی نہ ہو اور اپنے خالق سے شکوے کرنے لگے کہ اے اللہ تو نے ایسا کیوں کیا، جب نعمت چھیننا ہی تھی تو عطا کیوں کی تھی، اے خدا تیرا رحم وکرم

کیوں رخصت ہوگیا اور اے کاش کہ ایسا نہ ہوتا یہ تو ہم پر بہت بڑا ظلم ہوگیا، یقیناً اس طرح رونا، گریہ وزاری کرنا اور واویلا مچانا حرام اور شرافت بشری کے خلاف ہے۔

رسولؐ اکرم جس طرح اپنے فرزند ابراہیمؑ پر روئے، اپنے چچا حمزہؓ وجعفرؓ پر گریہ فرمایا اور امامہ بنت زینب پر آنسو بہائے، اس سب سے زائد اپنے چھوٹے نواسے حسینؑ پر روئے اور رونے کی ہمیں ترغیب بھی دی ہے۔

مسند ابن حنبل کی روایت ہے کہ ''مَنْ بَكٰى عَلَى الْحُسَيْنِ وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ''اس کا رشہ عظمٰی کے رونما ہونے سے پچاس سال قبل صرف اس کی خبر سن کر رسولؐ اسلام متعدد مرتبہ روئے جس کو علماء و مورخین اسلام نے مختلف مقامات پر درج فرمایا ہے۔

ابوبکر ابن شیبہ نے مقنف میں، عبدالرزاق نے مسند میں اور ابن منصور نے سنن میں روایت کی ہے کہ ''جناب رسالتمآب ایک دن بے اختیار گریہ فرمارہے تھے، جب سبب گریہ دریافت کیا گیا تو فرمایا ''جب سے حسینؑ کی خبر شہادت سنی ہے، میرے آنسو تھمتے ہی نہیں۔'' بیہقی اور ابو نعیم ام المومنین ام سلمہ رضوان اللہ علیہا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسالتمآب ام المومنین کے حجرہ میں داخل ہوئے اور فرمایا کہ دیکھو ام سلمہؓ کسی کو داخل حجرہ نہ ہونے دینا، معلوم نہیں کس طرح حسینؑ حجرہ میں داخل ہوگئے، میں نے حجرہ کے اندر سے رسولؐ کے رونے کی آواز سنی قریب گئی حجرہ کا پردہ الٹا، دیکھا رسولؐ حسین کے بوسے لے رہے ہیں اور زار وقطار رورہے ہیں، میں نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ خیر تو ہے۔ فرمایا ''شہادت حسینؑ کی خبر جبرئیلؑ لائے تھے۔''

طبرانی نے معجم میں نقل کیا ہے کہ ایک دن رسولؐ خواب سے بیدار ہوئے اور ڈھاریں مار مار کر رونے لگے، عرض کیا گیا خیر تو ہے، فرمایا ''ایک دن میرا حسینؑ شہید کردیا جائے گا۔''

یاد رہے ابھی حسینؑ شہید نہیں ہوئے ہیں محض شہادت حسینؑ کی خبریں سنی ہیں اور عظیم سانحہ جو ۶۱ھ میں رونما ہوگا اس کے متعلق صرف یہ سوچ کر رسولؐ گریہ فرمارہے ہیں تو اب کسی مسلمان میں دم ہے جو جرأت کرکے یہ کہے کہ بعد شہادت حسینؑ ان کے ذکر پر رونا بدعت، ناجائز اور بے صبری ہے؟ پھر جبکہ کتاب تاریخ واخبار کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعد شہادت، رسولؐ نے گریہ فرمایا، انسان ہی نہیں، زمین وآسمان یہاں تک کہ بے جان پتھر روئے۔

ترمذی، نسائی، احمد اور حاکم نے جناب ام سلمہؓ سے روایت کی کہ ''حسینؑ کے عراق کی جانب روانہ ہونے کے بعد میں دن رات بے قرار رہا کرتی تھی یہاں تک کہ عاشور کے روز ظہر کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتی ہوں کہ رسالتمآب بحال پریشاں تشریف فرما ہیں۔ چہرہ و ریش مبارک غبار آلود ہے، زلفیں بکھری ہوئی ہیں، لباس پر خون کی چھینٹیں ہیں، آنکھوں سے سیلاب اشک جاری ہے۔ آنسوؤں سے ریش مبارک تر ہوگئی ہے اور ہاتھ میں ایک خون بھرا شیشہ ہے جس میں خون تازہ جوش مار رہا ہے میں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ خیر تو ہے میں سرکار کی یہ کیا حالت دیکھ رہی ہوں'' فرمایا ''اے ام سلمہ تم کیا بیٹھی ہو،

صبح سے مقتل حسینؑ میں تھا، امت نے میرے حسینؑ کو میرے سامنے ذبح کر دیا۔ یہ خون اسی کا ہے۔''

مدینہ میں اس محترم خاتون نے یہ خواب دیکھا اور عین اسی وقت مکہ میں جناب ابن عباس جیسی محترم شخصیت نے رسولؐ کو اسی حالت میں دیکھا۔

بیہقی اور ابو نعیم روایت کرتے ہیں کہ قتل حسینؑ کے روز آسمان سے خون برسا اور زمین سے اتنا خون ابلا کہ ہمارے برتن سب خون سے بھر گئے۔

بیہقی ہی نے زہری سے روایت کی ہے کہ عاشور کے دن ہر درخت اور پتھر کے نیچے سے تازہ خون نکلتا تھا۔

ان تمام روایتوں نے جو فرزندان اسلام کی کتابوں سے نقل ہوئیں یہ معلوم ہوا کہ سبط رسولؐ کے غم میں آنسو بہانا، سروں پر خاک اڑانا، سرو پا برہنہ ہونا اور مختلف طریقوں سے عزائے حسینؑ قائم کرنا نہ حرام ہے نہ بدعت۔ لیکن ہر قربانی کا ایک مقصد ہوتا ہے اگر وہ مقصد، اس فداکاری پیش کرنے والے سے بلند ہے تو وہ قربانی، شہادت ہے ورنہ ہلاکت۔ دیکھنا یہ ہے کہ حسینؑ کا مقصد کیا تھا؟ اگر حسینؑ کا مقصد یہ تھا کہ یزید اور یزیدیوں کے ترکش ظلم وتشدد کے آخری تیر کو اپنے صبر وضبط اور مظلومی کے سینے پر کھا کر، رقیق القلب آدم زاد نوع بشر کو قیامت تک اپنی ذات پر رُلائیں تو پھر نمازوں کا پڑھنا بیکار، روزہ رکھنا فضول خمس وزکات ادا کرنا غلط اور حج و جہاد نادرست ہوگا، ہمارا چند آنسوؤں کا بہالینا، مقصد حسینؑ کی تکمیل کا ذریعہ ہوگا۔

اے انسان ذرا عقل سے کام لے کیا اس انوکھی اور محیّر العقول فداکاری جو کربلا کے بے آب وگیاہ میدان میں دنیا کے سامنے پیش کی گئیں اس کا مقصد یہی تھا کہ رونے والا کوئی بھی ہو، عزادار حسینؑ جیسا بھی بدکردار، بداخلاق اور تارک عبادات ہو وہ نجات کا مستحق ہے اور جنت اس کی جاگیر ہے، اگر شہادت حسینی کا مقصد یہ تھا تو یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ حسینؑ اسلام کی بقا کے لئے اپنی حیات کا ہر لمحہ قربان کر دینا چاہتے تھے۔ اسلام کو سرخرو رکھنے کے لئے اپنی جان تک سے دریغ نہیں کی۔ وہ اسلام جو ان کو اپنے نانا، رسولؐ کے ہاتھوں ملا تھا اس کی حفاظت کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور آئین شریعت وقوانین اسلام کی حفاظت ان کا نصب العین تھا۔ یاد رکھو حسینؑ کا یہی مقصد تھا جس کے بچانے کے لئے میدان کربلا میں ایک مٹھی جماعت کے ساتھ آ گئے، وہ گھر سے بے گھر ہوتے تھے لیکن یہ سننا بھی نہیں چاہتے تھے کہ اسلام دنیا میں ایک نئے اور جھوٹے رنگ میں پیش کیا جائے۔ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی قربانی گوارہ کر سکتے تھے مگر اپنی جان سے زیادہ عزیز چیز، اسلام کو سرسبز دیکھنا چاہتے تھے۔ عزیزان اسلام اور دوستوں، حسینؑ کے مقصد کو سمجھو، تم رو اور چیخیں مار مار کر رو، مجلسیں برپا کرو، علم اٹھاؤ اور ڈیوڑھوں پر ڈیوڑھیں اٹھاؤ مگر جب اذان کا وقت آئے تو فوراً خاموش ہو جاؤ اور کسی قریبی مسجد میں جا کر فریضۂ واجب کی ادائیگی میں مشغول ہو جاؤ اور فریضہ کی فراغت کے بعد اپنی انجمن عزا کو آگے بڑھاؤ، پوری رات واحسینا کی گونج میں شب بیداری کرو مگر نماز صبح سے غافل ہو کر سو نہ جاؤ بلکہ شہزادے علی اکبرؑ کی یاد میں صبح کو اذانیں دے کر نماز

صبح کا فریضہ ادا کرو۔

اس طرح حسینی مشن کی تبلیغ کرو اور ان کے مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنو۔

کربلا کا معرکہ کوئی مادی مقابلہ نہ تھا بلکہ حق اور باطل، نور و ظلمت، اسلام و کفر کا مقابلہ تھا۔ ایک طرف بندوں کا بنایا ہوا رہنمائے دین تھا جس کے منھ سے شراب کی بوآتی تھی جس کی حسن پرست طبیعت نے ماں بہنوں کی تمیز اٹھا دی تھی، جو بندروں سے کھیلتا اور کتوں کو لڑاتا تھا، جس کے قصر ابیض میں اذان کی آوازیں، نرد و شطرنج کے پانسوں کی صداؤں میں کھو جاتی تھیں، جس کے اندر لوازم انسانیت کا تو پتہ بھی نہیں تھا مگر شرائط خلافت سب کی سب موجود تھیں اور جس کی کرشمہ سازیوں نے عبداللہ ابن عمر جیسے خلوت پسند کو بھی رام کر لیا تھا، ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ ہاتھ جو یداللہ کی بیعت کے وقت شل ہو گیا تھا، یزید سے مصافحہ کے لئے بڑھ گیا اور وہ سر جو راس رسولؐ کے سامنے تنا رہا، اس شراب خور خلیفہ کے سامنے جھک گیا۔ ایک طرف یہ ننگ بشریت خلیفہ تھا اور دوسری طرف خدا کا منتخب کیا ہوا امام عادل تھا جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملت اسلامیہ کی خدمت کیلئے وقف تھا، جس کا اسوۂ حسنہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتا تھا۔

مختصر یہ کہ ایک طرف شر محض اور دوسری طرف خیر مجسم، ایک طرف بہیمیت تھی اور دوسری طرف انسانیت، ایک طرف خانہ ساز خلیفہ تھا اور دوسری طرف منصوص من اللہ امام۔ گویا خدا و بندہ کا مقابلہ اور یزدان واہرمن کی جنگ حسینؑ اور اصحاب حسینؑ نے کربلا کی سہ روزہ زندگی میں بھوکے پیاسے رہ کر مصائب و آلام برداشت کر کے ظلم و تشدد کا مقابلہ صبر و شکیبائی سے کر کے تمام دنیا پر ثابت کر دیا کہ حق کس کی طرف ہے اور باطل کا دامن کون پکڑے ہے، خدائے وحدہ لاشریک کے سامنے کون سربسجود ہے اور شیطان کا پجاری کون اے شہیدان کربلا تم پر لاکھوں سلام ۔تم نے حفاظت اسلام میں جان دے کر حیات جاوید حاصل کر لی۔

☆☆☆

کارنامۂ حسینؑ کی منفرد خصوصیت

علامہ سید علی محمد نقوی صاحب علی گڑھ

گلشن عالم میں ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک کروروں واقعات کے رنگا رنگ پھول کھلے اور مرجھا گئے۔کوئی جلدی ہی دورِ خزاں کی نذر ہو گیا، کوئی دیر میں مرجھا گیا، کسی پھول کی خوشبو صرف اسی تک محدود رہی کسی کی ذرا دور تک گئی، اور بعض ایسے پھول کھلے جنھوں نے اپنی خوشبو سے پورے گلستاں کو معطر کر دیا، جس سے گلشن کے سبھی باسی فیضیاب ہوئے مگر پھر جب بادِ خزاں کے جھونکے سنسنائے تو نہ یہ پھول رہ گئے نہ ان کی خوشبو، گلزار کی دوسری نسلوں کو یاد بھی نہیں رہا کہ یہاں کوئی ایسا پھول بھی کھلا تھا۔جس کی خوشبو کے سائے میں ہمارے آبا و اجداد رنج و آلام کے سورج کی نہ جانے کتنی تکلیف دہ کرنوں سے بچ گئے تھے، مگر ان واقعات کے ان گنت پھولوں میں ایک ایسا پھول بھی کھلا، جس کی خوشبو نہ صرف اسی تک محدود رہی بلکہ گلزار کا کونہ کونہ اس سے بس گیا۔بادِ خزاں کے جھونکے آتے جاتے رہے، تاریخ کے اوراق پلٹتے رہے، آشیاں بنتے اجڑتے رہے، بجلیاں گرتی رہیں، تباہیاں گلشن کا طواف کرتی رہیں مگر اس پھول کی خوشبو جس طرح تھی اسی طرح قائم رہی۔

یہ واقعہ کربلا تھا:

واقعات واتفاقات وحادثات کے مجموعے کا نام انسان ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں اس کے تناسب سے دو ایک قابلِ لحاظ واقعات ضرور رونما ہوتے ہیں۔مگر ایسے واقعات بہت کم عالم وجود میں آتے ہیں جن کی روشنی اس انسان کی ''تنگنائے ذات'' سے نکل کر دوسرے کے لئے شمع راہ بن گئی ہو۔بعض ایسے عظیم واقعات رونما ہوئے، جن میں ایک حد تک لوگوں نے اپنے درد کا درماں تلاش کیا، مگر یہ واقعات بھی زمانے کی رفتار کا چند صدیوں تک ساتھ دینے کے بعد ماضی کی پر ہول تاریکیوں میں ٹمٹما کر رہ گئے اور کاروانِ بشر ہی آگے بڑھ گیا۔نئی نسلوں کے لئے یہ گونا گوں واقعات محض نقش و نگار طاقِ نسیاں بن کر رہ گئے۔اب اگر کسی مورخ نے پرانی تاریخی کتابوں کا عصا اور اپنے علم و عقل کا چراغ لے کر ماضی کی تاریکیوں میں جانے کی ہمت کی تو اسے ان واقعات کی دھندلی دھندلی پرچھائیاں نظر آگئیں اور بس۔مگر یہ کارنامۂ حسینی کی خصوصیت ہے کہ جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے والی نسلوں کے لئے چراغِ ہدایت تھا اسی طرح بیسویں صدی کے انسانوں کے لئے ہے۔جس طرح تیرہ سو سال قبل کے انسان واقعۂ کربلا میں اپنے درد کا درماں تلاش کر سکتے تھے اسی طرح آج کی نسل بھی اس میں اپنے زخم کا مرہم ڈھونڈ سکتی ہے۔یہ حسینی کردار کا امتیاز ہے کہ ہم کو اس دور میں بھی توشۂ حیات فراہم کرتا رہا، جب ہم

اسیرِ توہمات تھے، اور آج بھی ہمیں سرمایۂ حیات فراہم کر رہا ہے، جب ہم خواب و خیال کے شیش محل سے نکل کر حقائق کے سورج کی کڑی دھوپ میں سرگرم عمل ہیں، ان منزلوں پر بڑی بڑی جلیل القدر ہستیوں کے کردار پگھل جاتے ہیں، بڑے بڑے اربابِ نظر تھرا کر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، کانپ کانپ کر سپر ڈال دیتے ہیں۔

بڑے بڑے رہنما اصولوں کے سوتے اس انسانی عقل و فہم کی تیز دھوپ میں خشک ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ حسینی اصولوں کے سوتے ہیں جو جیسے جیسے عقل و علم کی دھوپ تیز ہوتی جارہی ہے ابلتے چلے جارہے ہیں۔

سوائے واقعۂ کربلا کے کوئی دوسرا واقعہ نہیں جو ہمارا تاریخ کے ہر ہر موڑ پر ساتھ دیتا رہا ہو۔ یہ حسینی کارنامے کی منفرد خصوصیت ہے کہ ہم تیرہ سو سال قبل بھی اپنے مسائل کا حل اس میں تلاش کر سکتے تھے اور آج بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ بیسویں صدی میں انسان جن مسائل سے دوچار ہے ان میں جنگ کی تباہیوں کو روکنے اور دولت و افلاس کے درمیان جو خلیج ہے، اسے پاٹنے کے مسئلے سب سے اہم ہیں۔ جنگ کے خلاف آج ہر طرف امن کانفرنسیں بلائی جارہی ہیں۔ فلاسفہ و حکماء حل پیش کر رہے ہیں۔ کوئی پُر امن بقائے باہم کا اصول پیش کر رہا ہے، کوئی اہنسا کا درس دے رہا ہے، کوئی ''جیو اور جینے دو'' کی پرانی بات کو اپنی اپنی لفظوں میں دہرا رہا ہے مگر دراصل یہ تمام حل حسینؑ اپنے کردار و گفتار سے آج سے تقریباً چودہ سو سال قبل پیش کر چکے ہیں، جو کربلا کے بن میں خون کی رنگین دھاروں سے لکھے گئے تھے۔ ان

پھولوں کا رنگ و روپ دور سے اجنبی محسوس ہوتا ہے مگر قریب جاکر ''ذوق نظارہ'' کو قوت احساس میں سموکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خوشبو وہی ہے جو گلدستۂ کربلا سے ۶۱ھ میں اڑی تھی اور جس سے آج تک بعض انسانی مشام جاں بسے ہوئے ہیں، ہلال محرم نے اپنے سفر کا آغاز ہی کیا تھا کہ شبیری قافلہ اپنی منزل پر پہونچ گیا۔

مہینے کی دوسری تاریخ حسینؑ سرزمین کربلا پر آگئے، اور تیسری سے یزیدی فوجیں آنا شروع ہوگئیں۔ نو محرم تک کربلا کا ریتیلا میدان افواج یزیدی سے لبالب ہو چکا تھا۔ زمین کثرت نفوس سے چھلک رہی تھی، کاروان فطرت اپنی عمر میں پہلی بار ظلم و ستم کا اس بڑے پیمانے پر ننگا ناچ دیکھنے کے لئے تیار ہو رہا تھا، اور اس وقت یزیدی افواج کا سردار عمر سعد حسینؑ سے صلح کی بات چیت کرنے میں مصروف تھا۔

امام حسینؑ نے صلح کی جو صورتیں پیش کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مجھ کو ہندوستان یا کسی اور دور دراز ملک میں چلے جانے دو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حسینؑ کی یہ شرط پر امن بقائے باہم اور ''جیو اور جینے دو'' کے اصول کا سنگ بنیاد نہیں ہے۔

''اگر تم ہماری ذات کو اپنے اور اپنے مشن کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہو۔ اور حق کی آنچ سے تمہارے دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں تو ہم تمہاری سلطنت ہی سے باہر چلے جانے کو تیار ہیں، پھر تو تمہارے لئے کوئی خطرہ نہ رہے گا۔''

کیا کوئی ہمیں بتا سکتا ہے کہ ''جیو اور جینے دو'' کا اصول حسینی ارشاد کی صدائے بازگشت نہیں تو اور کیا ہے۔ اور قرآن ناطق حسینؑ کے دہن سے جو پھول بن کر فضا میں بکھر گیا، وہ اس سے پہلے قرآن سامت کے صفحات پر روشنائی بن کر بکھر چکا تھا۔ سورۂ کافرون کی آیت ''لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ'' (تمہارا دین تمہارے ساتھ ہے اور ہمارا دین ہمارے ساتھ) کس کو یاد نہیں۔

پیغمبرؐ خدا تو ارشاد فرما ہی چکے تھے کہ حسینؑ اور قرآن کبھی الگ نہیں ہو سکتے۔ جو قرآن بزبان بے زبانی کہہ چکا تھا وہی حسینؑ نے عمر سعد سے کہا۔

آج کل تشدد کے مقابلہ کے لئے ایک اور ہتھیار کا بڑے زور وشور سے نام لیا جاتا ہے، جس کا تجربہ بظاہر سب سے پہلے ہمارے ہی ملک میں ہوا تھا۔ یہ اہنسا ہے جس میں ظالم کو اپنے اخلاقی جوہروں سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حسینؑ نے واقعۂ کربلا کے سلسلے میں اس ہتھیار سے بھی دنیا کو روشناس کرا دیا۔

وہ موقع ہے جب ابن زیاد حاکم کوفہ کی طرف سے ایک ہزار سپاہی حر کی قیادت میں حسینؑ کا راستہ روکنے کے لئے آئے ہیں۔ لیکن سب پیاس سے جاں بلب ہیں۔ سواروں کے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے ہیں۔ گھوڑوں کی زبانیں منھ سے باہر نکلی ہوئی ہیں۔ عرب کی دوپہر کا غضبناک سورج گویا جہنم کو دنیا پر انڈیلے دے رہا ہے، اور اس صورت حال میں حسینؑ یہ جانتے ہوئے کہ ساتھ میں پھول جیسے بچے اور عورتیں ہیں اپنے قافلے کی مشکیں دشمن کی سیرابی کے لئے کھلوا دیتے ہیں اور یہاں تک پانی پلواتے ہیں کہ جب تک مرکب اور راکب خود منھ نہیں ہٹاتے۔ مشک کے دہانے بند نہیں کئے جاتے۔

کیا اس برتاؤ سے پتھر کا دل بھی نرم نہیں ہوسکتا؟ کیا آج بھی کردار کے ایسے سانچوں سے جنگ آزمائیوں کو مکمل امن وسکون میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کربلا میں جس دشمن سے سابقہ پڑا تھا، وہ انسانیت ہی سے معرا تھا، وہ اپنے ارادوں سے صرف اسی صورت میں باز آسکتا تھا کہ اپنے اصولوں اور مقاصد کے سر، ایک زریں طشت میں سجا کر اس کے سامنے پیش کئے جاتے اور حسینؑ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے اصولوں کی قربانی پیش کر کے ایمان وشرافت حسن وصداقت اور انسانیت، سب کے خون میں اپنے ہاتھ رنگتے۔ تاریخ کی روشنی میں راہ دیکھتے وقت امام حسینؑ کا ایک اور ایسا قول ملتا ہے جو تمام کشمکشوں کا واحد حل ثابت ہوسکتا ہے۔

موقع وہ ہے جب فوج حر کو پانی سے سیراب کرنے کے بعد امام حسینؑ اور حر کے مابین گفتگو کے نتیجے میں طے ہوتا ہے کہ امام نہ کوفے کی سمت جائیں، نہ مدینے کی جانب، بلکہ ایک تیسری طرف جائیں، اور یزیدی لشکر نگرانی کے لئے ساتھ ساتھ رہے یہی تیسرا راستہ فرات کی طرف رہنمائی کرتا تھا، جب حسینی قافلہ اور یزیدی لشکر کربلا پہونچا تو حاکم کوفہ کا حر کے پاس حکم آگیا کہ حسینؑ جہاں ہیں وہیں روک دو۔ حسینؑ اتر جاتے ہیں اور اپنے جانبازوں کو حکم دیتے ہیں کہ دریا کے کنارے خیمے نصب کرو۔ حر آکر کہتا ہے کہ

ہمیں تاکید ہے کہ آپ کے قافلے کو ایسی جگہ اتروائیں جہاں نہ پانی ہو نہ گھاس تاکہ حسینی قافلے کے انسان بھی بھوکے پیاسے رہیں اور جانور بھی یہ سنتے ہی اصحاب حسینؑ بپھر جاتے ہیں۔ زہیر بن قینؑ جو قریب ہی کھڑے تھے عرض کرتے ہیں ''مولا'' ہم کو ان سے نپٹ لینے دیجئے ورنہ اس کثرت سے کمک آجائے گی کہ مقابلہ دشوار ہو جائے گا۔

حسینؑ نے زہیرؑ کے اس دوستانہ مشورے کا جواب دیا ہے اگر اسی کو ہر انسان، ہر ملت اور ہر طاقت گرہ میں باندھے اور دل میں اتارلے تو جنگ کے بادل افق جہاں پر سے چھٹ جائیں اور انسان کھلی فضا میں سانس لے سکے۔

حسینؑ فرماتے ہیں، زہیر! میں جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آج ہر ایک صرف اتنا ہی طے کرلے کہ وہ جنگ میں پہل نہیں کرے گا تو جنگ ہو ہی نہیں سکتی۔ حسینؑ کا یہ جملہ آج کے پورے مسئلۂ جنگ کا حل ہے۔ امام حسینؑ نے واقعۂ کربلا کے سلسلے میں جو اصول پیش کئے ہیں۔ اگر انسان ان پر سچے دل سے عمل کرنے کی ٹھان لے تو تمام کشمکش مکمل دوستی اور تمام جنگ آزمائیاں مکمل امن اور تمام اختلافات مکمل ہم آہنگی میں بدل سکتے ہیں۔

آج کی دنیا کا دوسرا سب سے اہم مسئلہ ''مساوات'' کا ہے۔ دنیا میں آج باہمی انسانی تفریق کی نہ جانے کتنی دیواریں کھڑی ہیں۔ کتنے غیر انسانی اور غیر فطری بت پوجے جارہے ہیں، کوئی کالوں کو بنی نوع انسان میں داخل کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے، کوئی بے سہارا اور بیکس لوگوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنا اپنا مذہب خیال کرتا ہے، کوئی ممالک کے ڈھکوسلوں میں گرفتار ہے، دوسرے ملک والے کو گویا خاک کا پتلہ بھی نہیں سمجھتا۔ غرض اب تک نا جانے کتنے دماغوں پر پیسے اور رنگ وروپ کی منحوس حکومت قائم ہے، کتنی عقلوں پر سرمایہ داری کی مہر لگی ہوئی ہے، مگر اب انسان خواب غفلت سے چونک رہا ہے اب اس محدود ''آدمیت'' کا طلسم ٹوٹ رہا ہے، عقائد کی یہ غیر فطری زنجیریں پگھل رہی ہیں۔ ہر طرف سے اس حیوانی جذبہ کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ انسان اس تفریق کے ختم کرنے پر غور کررہا ہے مگر اب بھی وہ کسی حل سے کوسوں دور ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں جو مسئلے کا حل تلاش کررہے ہیں، اکثریت ایسوں کی ہے جن کے ذہنی سانچے قوم پرستی اور سرمایہ داری میں ڈھلے ہوئے ہیں، اسی وجہ سے وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ اسلام نے آج سے صدیوں پہلے دنیا کو پیغام دیا تھا، کہ سب انسان ایک خدا کے خلق کردہ ہیں، چاہے گورے چاہے کالے چاہے عجم چاہے عرب، چاہے مفلس چاہے سرمایہ دار، اس پیغام کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کی ذہنیت ایسی بن جائے کہ وہ اپنے کردار سے کسی قسم کی تفریق کا مظاہرہ نہ کرسکیں آج کے مصلح زبان سے تو بہت کچھ کہتے ہیں، سرمایہ داروں اور قومیت پسندوں کو خوب خوب سناتے ہیں، لیکن اگر شامت اعمال سے کوئی مفلس زدہ حالت میں اطلس وکم خواب کے حریری پردوں کو چھیڑتا اور ریشمی قالینوں کو کچلتا ہوا ان کے شبستان کی محفل طرب میں داخل ہو جاتا ہے تو ان کی

پیشانیوں پر بل آجاتے ہیں، زبان بے قابو ہوجاتی ہے، یہ ان مصلحین کے کردار گفتار کی یکسانیت! جب خود معالج، مرض کا ہمدرد ہوتو مریض کی صحت کا خواب شرمندہ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

واقعۂ کربلا میں حسینؑ نے اپنے کردار سے دنیا کو روشناس کرادیا کہ مساوات کیا شے ہے؟

حسینؑ کے چھوٹے سے قافلے کا ذرا چشم تصور سے نظارہ کیجئے! اس میں ہاشمی نوجوان بھی ہیں اور غیر ہاشمی سورما بھی، عرب بھی غریب غلام بھی، قبیلوں کے سرادار بھی، حبشی رنگ بھی اور عربی حسن بھی اور حسینؑ کربلا کے ایسے ہوشربا ماحول میں ان کے درمیان مساوات کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

جو پکارتا ہے امام بہ نفس نفیس اس کے سرہانے جاتے اور کڑیل جوان نور نظر علی اکبرؑ کے سرہانے جاکر ان کا سر زانو پر لیتے ہیں، تو غلام جون کی آواز پر بھی جاکر اس کا سر اپنے زانو پر رکھتے ہیں۔ جنگ کے لئے میدان میں جاتے وقت اگر ماں جائی بہن زینبؑ سے رخصت ہوتے ہیں تو کنیز فضہ کو بھی آخری سلام کرتے ہیں، یہ ہے حسینی کردار!

بیسویں صدی میں دولت و افلاس، سیاہی و سفیدی، عرب وعجم کے درمیان خلیج، نہ ان مصلحین کے غور و خوض سے پر ہوسکتی ہے جن کا قول خود انہیں کے عمل سے ٹکراتا ہے، اور نہ طاقت کے ذریعہ سے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ ہر انسان اپنے خیالات کو شبیری کردار کی کسوٹی پر پرکھے۔ اس میں حسینی اسپرٹ پیدا ہوجائے، اور اس کے ذہن کی رگوں میں کربلا کے شہیدوں کا خون دوڑنے لگے۔

واقعۂ کربلا کو عالم وجود میں آئے تیرہ سو سال سے زیادہ گذر چکے ہیں مگر آج بھی انسان اپنے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کا حل ذات حسینی میں ڈھونڈ سکتا ہے۔ آج بھی انسانی مشام کا رنامۂ حسینی سے معطر ہوکر اس جہان کثیف کو کثافتوں اور غلاظتوں سے پاک کرسکتے ہیں اور ایک ایسا لطیف ماحول بنا سکتے ہیں جس کی طرف عالم بالا کے رہنے والے بھی نگاہ رشک سے دیکھنے پر مجبور ہوجائیں۔

شناخت نفس امارہ و نفس مطمئنہ

حکیم امت ڈاکٹر مولانا سید کلب صادق صاحب قبلہ

کونسی وہ شئی ہے جو آج کے انسان کے قابو میں نہیں آ گئی۔ امراض پر اس نے قابو پا لیا۔ بہت سے وہ امراض جو پہلے نا قابل علاج اور موت کی تمہید سمجھے جاتے تھے وہ اب قابل علاج ہو چکے ہیں۔

زمین پر اس نے قابو پا لیا انسان نہ صرف یہ کہ زمین کے اوپر دندناتا پھر رہا ہے بلکہ زمین کے سینہ کو چیر کر اس کے خزانوں پر قبضہ کرتا چلا جاتا ہے۔

دریاؤں پر اس نے قابو پا لیا بند باندھ کر جدھر چاہتا ہے ان کا رخ موڑ دیتا ہے اور کبھی اس پانی کے زور سے ٹربائینیں چلا کر بجلی پیدا کرتا ہے بجلی بنتی ہے تو گھر روشن ہوتے ہیں، ریڈیو بولنے لگتے ہیں، ٹی وی جگمگانے لگتے ہیں، کارخانے چلنے لگتے ہیں، مشینوں میں جان پڑ جاتی ہے، گاڑیاں دوڑنے لگتی ہیں۔

سمندروں پر اس نے قابو پا لیا اس کے بنائے ہوئے دیو پیکر جہاز موجوں کو روندتے پانی کا سینہ چیرتے ہوئے جدھر چاہے بڑھتے چلے جاتے ہیں غوطہ خور کشتیاں سمندر کی تہوں میں ڈوبی ہوئی قعر سمندر میں چھپے ہوئے سربستہ رازوں کو آشکار بناتی چلی جاتی ہیں۔

ہوا پر انسان نے قابو پا لیا اس کے بنائے ہوئے ہوائی جہاز اسے لیے ہوئے شہروں شہروں ملکوں ملکوں اڑتے پھرتے ہیں۔

حد یہ ہے کہ خلائیں بھی انسان کے قابو میں آتی چلی جاتی ہیں انسان کے قدم چاند کی زمین کو روند چکے، اب اس کی نظر سیاروں اور کہکشاؤں پر ہے۔

اس ذرہ خاکی نے سائنس کے ذریعہ کس شے پر قابو پا نہیں لیا؟ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک جس سے جب چاہتا ہے بات کرتا ہے، موسم کے سرد و گرم سے بے نیاز ہو چکا ہے ایرکنڈیشنڈ گھروں میں رہتا ہے اور ایرکنڈیشنڈ سواریوں میں سفر کرتا ہے۔ ''کولڈ اسٹورج'' کی بدولت ہر زمانہ اور ہر جگہ کے پھل کھاتا ہے

مختصر یہ کہ ''جسم اصغر'' دھیرے دھیرے ''عالم اکبر'' پر قابو پاتا چلا جاتا ہے مگر حیرت ہے کہ ''عالم اکبر'' کو دھیرے دھیرے اپنے قابو میں لانے والا انسان اگر قابو نہیں حاصل کر پا رہا ہے تو اپنے ہی اس ننھے دل پر جو خود اس کے سینہ میں دھک دھک کر رہا ہے بلکہ صورت یہ ہے کہ دنیا جس قدر اسکے پنجۂ اقتدار میں آتی چلی جاتی ہے دل اسی تناسب سے ہاتھوں سے نکلا چلا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ دل ہی قابو میں نہ ہو تو انسان کیا قابو میں رہے گا! اور انسان قابو میں نہ ہو تو اس کی صلاحیتیں کب قابو میں رہیں گی؟ نتیجہ یہ ہے کہ جس قدر انسان کا اقتدار

بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کی ہلاکت خیزیاں بڑھتی جاتی ہیں، اور نوبت یہ آگئی ہے کہ پوری نوع انسانی کا وجود ہی خود انسان ہی کے ہاتھوں خطرہ میں پڑ گیا ہے۔

ہر شئے کا علاج انسان نے ڈھونڈ لیا مگر قلب پریشان اور ''نفس مضطرب'' کا علاج انسان کے بس کے باہر دکھائی دے رہا ہے۔ سکون قلب اور طمانینت روح کے لیے انسان گھبرا کر شراب کا سہارا لیتا ہے اور ایک منزل وہ آتی ہے کہ گویا غرق مئے ناب ہوجاتا ہے۔

کبھی جنس پرستی (Sex) کی طرف چل پڑتا ہے تو اس راہ میں ہر فطری حد کو توڑ دیتا ہے، نہ جنس کی قید رہتی ہے، نہ صنف کی، نہ رشتہ کی، نہ سن و سال کی، نہ اپنے کی اور نہ پرائے کی۔

کبھی دولت کی طرف جھپٹتا ہے تو حلال و حرام کی تفریق ختم ہوجاتی ہے۔ جعل، فریب، رشوت، ظلم، ستم، قتل اور غارت جس راہ سے بھی دولت مل سکے یہ سمیٹتا چلا جاتا ہے۔

مگر ساری خواہش پوری ہوجانے کے باوجود، دل کی یہ حسرت نکل جانے کے بعد بھی اسے سکون نہیں ملتا تو یہ مسکن دواؤں کا استعمال شروع کر دیتا ہے، خواب آور گولیاں کھانا شروع کر دیتا ہے اور اس کے بعد بھی ذہنی کرب اور اندرونی گھٹن (FRUSTRATION) کم نہیں ہوتی تو ذرا ذرا سی بات پر یا دوسروں کو قتل کر کے ان کی زندگی ختم کر دیتا ہے یا خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے

حیرت ہے کہ بار بار کے تجربہ کے باوجود انسان اس حقیقت کو نہیں سمجھ پا رہا ہے کہ عیاشیاں، دولت سائنس کی نت نئی ایجادیں مادی ہیں، یہ صرف اس کے جسم کو سکون دے سکتی ہیں، روح کو نہیں، قلب کو نہیں، قلب کو، روح کو نفس کو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے ''ایمان'' سے ''وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ /سورۂ نحل آیت:۱۰۶'' مالک حقیقی کی یاد سے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورۂ رعد آیت:۲۸)

تجربہ شاہد ہے کہ مادہ پرست فرد ہو یا قوم، آسائش اور اقتدار کو حاصل کرتی ہے تو نعمتوں اور آسایشوں کے نشے میں قابو کیا انسانیت کے جامے سے باہر ہوجاتی ہے اور حیوانیت کی اس منزل پر پہنچ جاتی ہے کہ جانور بھی شرمندہ ہوجائیں كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (سورۂ علق آیت:۶) اور نعمتیں جانے لگتی ہیں؛ اقتدار خطرے میں پڑتا ہے، مصیبتیں سامنے آجاتی ہیں تب بھی انسان ان نعمتوں اور اقتدار کو بچانے کے لئے شرافت اور انسانیت کے سارے حدود چھلانگ جاتا ہے وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ (سورۂ حج آیت:۱۱)

اس کے برخلاف خدا پرست انسان نہ نعمتوں کے وفور میں حد سے گزرتا ہے نہ مصیبتوں کے ہجوم میں مضطرب و پریشان ہوتا ہے اس کی نظر میں نعمتیں اور مصیبتیں امتحان کے دو پرچے ہوتے ہیں خالق کائنات جن کے ذریعہ انسان کا امتحان لیا کرتا ہے۔ اسے نعمتیں ملتی ہیں تو ان کو امتحان سمجھتا ہے۔ اس لیے ان نعمتوں کو اللہ کے بندوں کی راہ

میں صرف کر کے اجر آخرت کا طلبگار رہتا ہے اور اگر مصیبتوں میں گھرتا ہے تو اسے بھی اپنے لیے ایک امتحان تصور کر کے صبر واستقامت اور عزم واستقلال کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے رضاء پروردگار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے ان دونوں ہی موقعوں پر اس کا نفس مطمئن اور قلب پرسکون رہتا ہے

خلاصہ یہ کہ نفس دوطرح کے ہوتے ہیں ایک وہ نعمتوں کے وفور یا مصیبتوں کے ہجوم میں مضطرب و پریشان ہوکر انسان کو صراط مستقیم سے ڈگمگا دیں دوسرے وہ جو ان دونوں حالتوں میں پرسکون رہ کر انسان صراط مستقیم پر جمائے رکھیں پہلے قسم کے نفس کو مذہبی اصطلاح میں ''نفس امارہ'' اور دوسرے قسم کے نفس کو مذہبی اصطلاح میں ''نفس مطمئنہ'' کہا جاتا ہے۔

نعمتیں اور اقتدار ملنے پر نفس امارہ رکھنے والا انسان کیسا ہوجاتا ہے اگر یہ دیکھنا ہو تو نمرود، فرعون، یزید اور ہٹلر کے اپنے اپنے وقت میں دور اقتدار کو دیکھ لیں اور اقتدار خطرہ میں پڑے، مشکلیں اور مصیبتیں سامنے آجائیں تو نفس امارہ رکھنے والا انسان کیا ہوجاتا ہے، اس کے لیے بھی آپ انہی نمرود، فرعون، یزید اور ہٹلر کے اس دور کو دیکھ لیں جب ان کا اقتدار خطرہ میں آ گیا تھا آپ دیکھیں گے کہ کبھی ایک انسان کو جلانے کے لئے لاکھوں من لکڑیاں جمع کی جاتی ہیں، کبھی ہزاروں معصوم بچوں کو انکی ماؤں کی گودیوں سے چھین چھین کر ذبح کر دیا جاتا ہے، کبھی کبھی آل رسولؐ پر ایسا ظلم کیا جاتا ہے کہ لفظ یزید ظلم کا ہم معنی بن جاتا ہے اور کبھی ہزاروں کو زندہ جلا کر خود اپنی زندگی کا اپنے ہاتھوں خاتمہ کر لیا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف نفس مطمئنہ رکھنے والے افراد کا کردار ان دونوں موقعوں پر کیا ہوتا ہے اس کے شواہد بھی تاریخ میں موجود ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کو حکومت ملی اور ایسی کہ نہ اس سے قبل کسی کو ایسی حکومت ملی نہ اس کے بعد کسی کو ملے گی۔ مگر یہ حکومت ملی تو زبان سلیمان پر دل سے نکلی ہوئی یہ دعا تھی رَبِّ اَوْزِعْنِی اَنْ اَشْکُرَ ... الصَّالِحِیْنَ (سورۂ نمل آیت: ۱۹) ''پروردگارا مجھے توفیق دے کہ میں ہمیشہ شکر گزار ہوں ان نعمتوں کے لیے جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر نازل فرمائیں اور اس حکومت کے بعد میرا طرز عمل میرا طریقۂ کار ایسا رہے کہ تو خوش ہوجائے اور تو اپنے رحم وکرم کے صدقہ میں میرا شمار اپنے نیک بندوں میں کر لے'' خدا کے نیک بندوں کی دعائیں ان کے دلی جذبات اور طرز فکر کی آئینہ دار ہوتی ہیں وہ جس مقصد کے لیے دعا کرتے اس کی راہ میں تن من دھن سے لگ بھی جاتے ہیں۔ خدا کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ اسے خدا کے بندوں کی راہ میں صرف کیا جائے حکومت ملنے کے بعد جناب سلیمانؑ کا یہ عزم اس بات کی دلیل تھا کہ ان کے سینہ میں نفس مطمئنہ ہے نفس امارہ نہیں۔

حضرت یوسفؑ کو مصر پر حکومت ملی تو ظلم وعدوان تمرد وسرکشی کی نمونہ ہوئی جو نفس امارہ کی علامت ہوتی بلکہ آپ عفو وکرم کا نمونہ بن گئے حکومت ملی تو جان کے دشمنوں

کی بھی غذائی نا کہ بندی نہ کی بلکہ قحط پڑا تو کبھی با قیمت اور کبھی بے قیمت سامان غذا فراہم کیا گیا جن لوگوں نے یوسفؑ کے قتل کی سازش کی تھی ان کو معافی ہی نہیں دیدی گئی ، اپنے ساتھ دستر خوان پر کھانا کھلایا گیا۔ یہ کردار نفس مطمئنہ رکھنے والوں کا ہوتا ہے، نفس امارہ رکھنے والوں کا نہیں۔

صاحبان نفس مطمئنہ کے با اقتدار ہونے کی حالت کے کچھ اور مثالی نمونہ دیکھنا چاہیں تو تاریخ کے ان مقامات کی ورق گردانی کریں جب رسولؐ فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے تھے یا امیر المومنینؑ کو دنیاوی اقتدار ملا تھا۔

خطرات کے موقع پر اور مصیبتوں کے ہنگام میں اطمینان نفس، سکون قلب اور عظمت کردار کے نمونہ بھی صاحبان نفس مطمئنہ کی سیرت میں نمایاں ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے جلانے کے لیے آگ روشن کی گئی اور ایسی کہ تاریخ بشر میں نہ اس سے قبل اتنی آگ فراہم کی گئی تھی نہ اس کے بعد کبھی فراہم کی گئی۔ ایک انسان کے لیے اس قدر آگ کا فراہم کرنا اضطراب قلب نمرود کا پتہ دے رہا تھا مگر دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ کو منجنیق میں رکھ کر تیزی سے گھمایا جاتا ہے اور متعدد چکر دے کر آگ کے سمندر کی طرف اچھال دیا جاتا ہے ظاہری حالت میں موت و زندگی میں چند ثانیوں کا فاصلہ رہ گیا ہے، بھڑکتے شعلے قریب سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں ہوا میں قلابازیاں کھاتے جارہے ہیں، نہ ہاتھ قابو میں نہ پیر نہ سر قابو میں نہ دھڑ مگر اس عالم میں بھی جب جبرئیل آکر سوال کرتے ہیں هَلْ لَکَ حَاجَةٌ ؟ خلیل خدا کیا کوئی تمنا ہے؟ کوئی آرزو ہے؟ تو وہ جواب دیتے ہیں جو اس بات کا شاہد ہے کہ جسم چاہے قابو میں نہ ہو مگر صاحب نفس مطمئنہ کا دل و دماغ، نفس سب بالکل اطمینان و سکون کی حالت میں ہے۔ فرماتے ہیں ہے تو تمنا ضرور مگر تم سے نہیں کہوں گا، جبرئیل نے کہا تو پھر جس سے کہنا ہے اس سے کیوں نہیں کہتے، جواب دیا کہ وہ دل کی تحریر خود ہی پڑھ رہا ہے، کہنے کی ضرورت نہیں۔

حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے بچانے کے لئے راتوں رات بنی اسرائیل سمیت مصر روانہ ہو گئے فرعون کو خبر ہوئی تو زبردست لشکر لیکر تعاقب میں روانہ ہوا ابھی بنی اسرائیل بحر احمر کے قریب ہی پہنچے تھے اور سوچ ہی رہے تھے کہ اس سمندری پٹی کو کیونکر عبور کیا جائے کہ فرعون اپنے لشکر کو لیے ہوئے موجیں مارتا ان کے سر پر پہنچ گیا سامنے بھی موت، پیچھے بھی موت بنی اسرائیل لاکھوں تھے مگر گھبرا گئے، ٹھنڈے پسینہ آگئے، بے چین ہو کر کہا اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (سورۂ شعراء آیت: ۶۱) لو ہم تو دھر لئے گئے۔ مگر جناب موسیٰؑ تنہا تھے مگر صاحب نفس مطمئنہ تھے اس لئے کمال اطمینان کے ساتھ جواب دیا کہ: كَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ (سورۂ شعراء آیت ۶۲) ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا پروردگار ہے وہ ضرور نجات کی کوئی راہ پیدا کرے گا۔

حضور کریمؐ خطرات کے موقع پر کیسا مطمئن رہتے تھے اس کے لیے امیر المومنینؑ کا ارشاد ملاحظہ فرمائیں ''جب جنگ کا تنور بھرپور بھڑکنے لگتا تھا اور پر جگر افراد تک کو میدان میں ٹکنا دشوار محسوس ہونے لگتا تھا تو ہم کو رسولؐ کے مطمئن چہرہ

کو دیکھ کر صبر و سکون کا درس ملتا تھا۔''

شب ہجرت بستر رسولؐ پر کھنچی ہوئی تلواروں کے سایہ میں آرام کرتے رہنا صاحب نفس مطمئنہ ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

سیرت معصومینؑ کے یہ سارے ہی نمونہ خطرات، شدائد اور مصائب کے مقابلے میں صاحبان نفوس مطمئنہ کے سکون قلب اور طمانینت روح کے بہترین نمونہ تھے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سکون قلب طمانینت روح اور اطمینان نفس کا جو مظاہرہ حسین بن علیؑ نے کربلا کے میدان میں کیا وہ بالکل بے مثال تھا۔

کربلا کے قبل و بعد اللہ کے مقرب بندوں نے مصائب و خطرات میں سکون قلب کا ثبوت بیشک پیش کیا، مگر ہاں امتحان صرف ایک یا چند رخوں سے تھا، خطرات تھے مصائب تھے مگر قابل شمار، یعنی وہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا کیا مصیبتیں پڑیں اور یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون سی مصیبت نہیں پڑی۔

عظیم رہنما وہی ہوتا ہے جو حالات کا صحیح تجزیہ کرے، صحیح علاج تجویز کرے اور پھر علاج کو صحیح طریقہ سے انجام تک پہنچائے مگر تجزیہ، فکر اور عمل کی منازل انسان صحیح طریقہ سے اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جب ان تینوں منزلوں میں حالات کے زبردست دباؤ کے باوجود اس کا دل و دماغ پرسکون اور اطمینان کی حالت میں ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ حسینؑ نے حالات کا بالکل صحیح تجزیہ کیا، بالکل صحیح علاج تجویز کیا اور اس علاج کو صد در صد صحیح طریقہ سے شدید ترین ناگوار حالات میں روبہ کار کیا۔

حسینؑ نے مدینہ میں آنے والے حالات کے متعلق جو پیش بینی کی تھی وہ ادنیٰ جزئیات کی حد تک بالکل صحیح نکلی، جس موقع کے جس طریقۂ کار کا انتخاب کیا وہ بھی صد در صد درست تھا اور اس عمل کے مختلف مراحل کے لیے جن افراد کا انتخاب کیا ی انتخاب بھی محیّر العقول حد تک درست نکلا۔ مدینہ میں کیا ہوگا، مکہ میں کیا ہوگا، کربلا میں کیا ہوگا، بعد شہادت کوفہ اور دمشق میں کیا ہوگا یہ سب گویا حسینؑ اپنی دور رس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے پھر ہر عمل کے لیے حسینؑ نے جس طریقۂ کار انتخاب کیا اس سے بہتر طریقہ کار ممکن نہ تھا اور ہر طریقہ کار کے لیے جن افراد کو منتخب کیا ان سے بہتر افراد ممکن نہ تھے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے مضمون کافی نہیں کتاب کی ضرورت ہے۔

حسینؑ کا نمایاں کمال یہ نہ تھا کہ ہجوم بلا و مصیبت میں خود پرسکون رہے بلکہ حیرت کی بات یہ تھی کہ جن کو حسینؑ نے اپنے ساتھ لے لیا تھا، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں، بوڑھے ہوں یا بچے، آزاد ہوں یا غلام و کنیز، عرب ہوں یا عجم، ان سب کے عزم میں، ارادہ میں، صبر و ثبات میں جذبہ سر فروشی میں حسینی عزم، حسینی ارادہ، حسینی صبر و ثبات اور حسینی جذبۂ سرفروشی یوں جھلک رہا تھا کہ کربلا میں، کوفہ میں، شام میں لشکر حسینی کا ہر سپاہی مرد ہو یا عورت بوڑھا ہو یا بچہ اپنی جگہ پر حسینؑ بنا ہوا تھا۔ کربلا میں زیادہ تر مردوں کو صبر و استقامت کے جوہر دکھانے کا موقع ملا مگر کوفہ و شام میں عورتوں نے صبر و استقامت، عزم و استقلال کے محیّر العقول

کارنامہ پیش کیے اور غیروں تک سے کلمہ پڑھوالیا کہ ''تمہارے مرد بہترین مرد اور تمہاری عورتیں بہترین عورتیں ہیں''

ظاہر ہے جس کے ساتھی محیّر العقول صبر و ثبات کے نمونہ پیش کریں خود اس کا سکون و اطمینان کس شان پر ہو گا،اس کا اندازہ ہر ایک کر سکتا ہے۔

میرے خیال میں کربلا کی سب سے سنگین قربانی وہ تھی جو بظاہر سب سے زیادہ سبک تھی،جب ایک چھ ماہ کا بچہ حسینؑ کی گود میں خون میں نہا گیا تھا مگر اس منزل پر بھی حسینؑ کے سکون و اطمینان میں فرق نہ تھا،فرما رہے تھے پروردگارا یہ منزل بھی آسان ہے اس لیے کہ تو نظروں کے سامنے ہے۔

کربلا کے میدان میں دوستوں،عزیزوں،جگر کے ٹکڑوں کے لاشے اٹھانے کے بعد بھی بیکس سیدانیوں اور سہمے ہوئے بچوں کے پر ہول مستقبل کو نظروں میں رکھنے کے باوجود بھی،سیکڑوں زخموں کے ہوتے ہوئے بھی جہاد آخر میں حسینؑ کتنا مطمئن تھے اس کے لیے خود حسینؑ کے ایک دشمن کا بیان ہے:

''خدا کی قسم میں نے کربلا سے پہلے اور کربلا کے بعد کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اتنا مصیبت زدہ ہو،اتنا زخمی ہو،اتنا پیاسا ہو جتنا حسینؑ تھے اور پھر اتنا مطمئن ہو،اتنا پر سکون ہو جتنا مطمئن اور پرسکون حسینؑ جہاد آخر کے وقت دکھائی دے رہے تھے۔''

جہاد آخر ختم ہوا،شہادت کی منزل سامنے آئی،شمر خنجر بکف دکھائی دیا تو حسینؑ نے فرمائش کی نہ صرف یہ کہ مجھے اس معبود کی بارگاہ میں دو رکعت نماز شکرانہ ادا کر لینے دے جس کی یاد دل بسائی تو وہ قوت ملی،وہ طاقت برداشت ملی کہ پہاڑوں کو پگھلا دینے والے مصائب کے ہجوم میں نہ گھبرایا نہ تڑپا نہ مضطرب ہوا نہ دماغ معطل ہوا نہ فکر نے ساتھ چھوڑا۔حسینؑ نے نماز شروع کی،سر سجدہ میں رکھا،قاتل پشت پر آیا،گردن پر خنجر رواں ہوا اور حسینؑ کے کانوں میں مشیت کا نغمہ گونج رہا تھا یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلیٰ رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔اے نفس مطمئن اپنے رب کی طرف کامیابی اور کامرانیوں کے ساتھ پلٹ آ تو مجھ سے خوش میں تجھ سے راضی۔

اسلام زندہ ہوگیا بس کربلا کے بعد

قائد ملت مولانا سید کلب جواد نقوی (امام جمعہ لکھنؤ)

جب سے انسانیت کی عمارے کی نیو پڑی اور ابوالبشر نے زمین پر قدم رکھا، شیطنت نے بھی زمین پر اپنے جال بچھانا شروع کردیئے جس میں کمزور کردار کے بنی آدم پھنس گئے اور شیطان کے نمائندے بن کر حق کے نمائندوں کے مقابلہ پر آتے رہے بلکہ ان کا خون ناحق بہانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ انسانیت کی بقا کے لئے شیطنت کے مقابلے میں حق کے پرستاروں کو ہمیشہ اپنے خون کی قربانی دینا پڑی۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا ایثار جناب آدمؑ کا تھا جنھوں نے اپنے خون کی قربانی جناب ہابیلؑ کی صورت میں دی اور جناب ہابیلؑ نے بھی کردار کی انتہائی اعلیٰ مثال اس طرح پیش کی کہ جب قابیل خون بہانے پر تیار تھا تب بھی ہابیلؑ کی زبان پر یہی جملے تھے کہ بھائی چاہے تم مجھے قتل بھی کرڈالو مگر میں تم پر ہاتھ نہ اٹھاؤں گا کیوں کہ تم میرے بھائی ہو۔ راہِ تبلیغ میں جناب نوحؑ نے اپنے خون کی قربانی اس طرح دی کہ لوگ تبلیغ کے جواب میں پتھر مارتے تھے اور جناب نوحؑ کا جسم زخموں سے لہولہان ہوجاتا تھا۔ لیکن جناب نوحؑ شیطانوں کو انسانیت کا درس دینے سے دست کش نہ ہوئے۔

باطل کے مقابلہ میں حق کے نمائندہ جناب ابراہیمؑ کو بھی عظیم قربانیاں پیش کرنا پڑیں۔ اسی طرح جناب یحییٰؑ اور جناب زکریاؑ کی خونچکاں داستانیں تاریخ سے چھپی نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ قربانیوں کا یہ سلسلہ جناب خاتم النبیین تک پہونچتا ہے اور اعلان ہوتا ہے کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو شیطانی مشینری پوری طاقت سے حرکت میں آجاتی ہے اور رسولؐ کو کہنا پڑا ''مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ قَطُّ کَمَا اُوْذِیْتُ'' جتنی اذیت مجھے دی گئی اتنی کسی کو نبی کو نہیں دی گئی۔ کبھی انسانیت کے مصلح اور اسلام کے پیغمبر کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے تو تلوے خون آلود ہوئے، کبھی اتنے پتھر مارے گئے کہ چہرہ لہولہان ہوگیا۔ کوئی مددگار نہیں تھا سوائے ایک کمسن چچا زاد بھائی علیؑ کے جو ہر موقع پر سینہ سپر تھے۔ جنھوں نے کبھی مکہ میں بچوں کے پتھروں سے بچایا، کبھی شب ہجرت بستر رسولؐ پر سو کے حفاظت کی۔ کبھی بدر میں رسالت کے بدر کامل کا ہالہ اور کبھی احد میں شمع محمدی کا پروانہ بنے۔ رسولؐ اسلام نے انسانیت کی اصلاح کے لئے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جناب خدیجہ کی دولت کا ایک حبہ بھی اپنی اولاد کے لئے باقی نہ چھوڑا۔ پورا عرب زیر نگیں آگیا تھا لیکن شہنشاہ دین و دنیا کو اپنے پیٹ پر پتھر تک باندھے دیکھا گیا۔ یہی ایثار و قربانی کا جذبہ خون بن کر علیؑ کی رگوں میں بھی دوڑ رہا تھا۔ اور رسولؐ فرما بھی چکے تھے کہ ''یَا عَلِیُّ علیہ السلام لَحْمُکَ لَحْمِیْ وَ

دَمُکَ دَمِیْ'' اے علیؑ تمہارا گوشت و پوست میرا گوشت و پوست ہے اور تمہارا خون میرا خون ہے۔ قربانی کا مفہوم ہے دوسرے کے نفس پر اپنے کو مقدم رکھنا۔

اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دینا اور ضرورت پڑنے پر اپنی انتہائی محبوب چیزوں کو دوسری کسی اہم چیز کے لئے قربان کر دینا۔ امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی پوری زندگی اس طرح کی قربانیوں سے عبارت ہے۔ قربانی اس وقت حقیقی معنوں میں قربانی ہو گی جب قربان کی جانے والی شے یا تو محبوب ہو بس اس کی سخت حاجت ہو۔ اسی لئے قرآن مجید میں ہے ''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ'' ''تم ہرگز نیکی تک نہیں پہونچ سکتے جب تک وہ چیز راہ خدا میں نہ دو جس سے تم محبت کرتے ہو۔ جس قدر محبت اور خواہش کی حد بلند ہوگی اسی قدر قربانی کا مرتبہ بلند ہوگا۔ اپنے نفس سے زیادہ اور کیا چیز کسی کو عزیز ہو سکتی ہے لیکن امیر المومنینؑ اس شان سے اپنے نفس کو راہِ خدا میں پیش کرتے ہیں کہ مرضیٔ پروردگار کے مالک بن جاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ قربانی کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ آخر میں اسلامی تعلیم کی تبلیغ اور اپنے بلند اصولوں کی خاطر علیؑ کو اپنی جان کی قربانی دینا پڑتی ہے اور مسجد کوفہ کی محراب علیؑ کے سر کے خون سے سرخ ہو جاتی ہے۔

حضرت علیؑ کے جانشین امام حسنؑ کی زندگی بھی ایثار و قربانی کا بہترین نمونہ ہے۔ یہاں تک کہ تخت حکومت کی قربانی دیدی تاکہ حق کے نمائندہ پر اقتدار پرستی کا الزام نہ آجائے۔ لیکن اس پر بھی باطل کے نمائندے اور شیطنت کے پرستار مطمئن نہ ہوئے اور آخر میں امام حسنؑ تھے زہر ہلاہل تھا، خون کی کُلّیاں تھیں اور طشت میں جگر کے ٹکڑے تھے۔

اب نمائندۂ حق امام حسینؑ تھے اور باطل کی نمائندگی یزید کر رہا تھا۔ حق کے نمائندہ سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا۔ بھلا امام حسینؑ ایک فاسق و فاجر و ننگ انسانیت کی بیعت اور اطاعت قبول کرتے۔ اب امام حسینؑ کے لئے موقع تھا کہ دنیا کو بتا دیں کہ دین کیا ہے اور بے دینی کیا ہے؟ انسانیت کیا ہے اور حیوانیت کیا ہے؟ ملک فتح کر لینا کیا ہے؟ اور دلوں پر فتح پانا کیا ہے؟ امام حسینؑ کو معلوم تھا کہ انسانیت کی بقا کے لئے اور اسلام کی حفاظت کے لئے عظیم قربانیاں دینا ہوں گی اور اس کے لئے وہ تیار ہو کر اٹھے تھے۔ اور وہ کیا تھا جو امام حسینؑ نے قربان نہیں کر دیا۔ یہ امام حسینؑ کی قربانیوں کا امتیاز ہے کہ ان کی کوئی مکمل فہرست مرتب نہیں کر سکتا۔ جتنی گہری نظر سے فہرست کیوں نہ بنائی جائے وہ نامکمل رہے گی۔ ازل سے راہ حق میں قربانیاں پیش کی جاتی رہی ہیں اور حق و باطل میں تصادم ناموں کے اختلاف کے ساتھ ہمیشہ سے جاری رہا ہے مگر امام حسینؑ کی قربانیوں کی یہ انفرادیت ہمیشہ باقی رہے گی کہ دیگر مثالوں میں آپ یہ بتا سکتے ہیں کیا کیا قربان کیا گیا مگر امام حسینؑ کے سلسلے میں تو یہ ڈھونڈنا ہے کہ کیا قربان نہیں کیا گیا۔ وطن چھوڑا، نانا کے مزار سے جدا ہوئے، ماں اور بھائی کی لحد چھوڑی، حج کو نامکمل ترک کرنا پڑا، سخت گرمی اور بلا کی دھوپ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ سفر کی تکلیفیں

اٹھائیں لیکن انسانیت کے اعلیٰ اقدار کو نہ چھوڑا۔ حُر کا لشکر خون کا پیاسا تھا لیکن اپنے ساتھ کا سارا پانی پلا کر سسکتی ہوئی انسانیت کو پھر سے زندہ کیا۔

کیا بتائیں کہ اسلام کے شجر کی آبیاری کے لئے اور جاں بلب انسانیت کو نئی زندگی دینے کے لئے امام حسینؑ نے کس کس کا خون دیا۔ اصحاب کا خون، عزیزوں کا خون ، کڑیل جوان بیٹے علی اکبرؑ کا خون، برابر کے بھائی عباسؑ علمدار کا خون اور ایک خون اس زمین پر ایسا بہا جس کی نظیر تاریخ میں کبھی نظر نہ آئی وہ تھا ششماہے بچے علی اصغرؑ کا خون ناحق۔ مگر نہیں یہ خون زمین پر نہیں بہا اسے تو امام حسینؑ نے اپنے چہرے پر مل لیا گویا یہ روئے شہادت کا غازہ تھا۔

خود فرزند رسولؐ کا خون اس زمین پر مختلف طریقوں سے بہا۔ سینے کا خون ، پہلو کا خون، چہرے کا خون، جبیں کا خون اور سب سے آخر میں قلب مبارک کا خون جس کے بعد امامؑ میں سنبھلنے کی طاقت نہیں رہی۔

تقریباً تیرہ سو برس قبل رسولؐ اسلام کے اس فرزند نے عقلوں کو حیران کر دینے والی وہ قربانی پیش کی تھی جس کے زلزلہ افگن مناظر، تحمل بشری سے بالاتر صبر و اطمینان ، بے مثال دینداری، ہمت شکن مصائب، بے نظیر خدا شناسی اور مذہبی فدا کاری نے تمام عالم انسانی و ملکی اور تمام گروہ انبیاء و مرسلین کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔

کربلا میں سب افراد معصوم نہ تھے صرف امام حسینؑ یا چوتھے امامؑ اور پانچویں امامؑ کی شخصیتیں تھیں جو یقینی طور پر عصمت پوش تھیں۔ بنی ہاشم کے لئے بھی کہا جا سکتا ہے کہ آغوش عصمت کے پلے تھے مگر اصحاب پر نظر ڈالئے تو صرف شیعہ اور محب اہل بیتؑ تھے مگر انہوں نے بھی ایثار و قربانی کے ایسے بے نظیر مرقع پیش کئے کہ امام حسینؑ کو کہنا پڑا کہ مجھ سے زیادہ باوفا اصحاب کسی کو نہیں ملے۔ امام عصرؑ نے ارشاد فرمایا ''اے اصحاب حسینؑ میرے ماں باپ تم پر فدا ہو جائیں''

یقیناً رسولؐ اور امیر المومنینؑ کو سلمانؓ و بوذرؓ مقدادؓ و قنبرؓ اور میثمؓ و مالک اشترؓ جیسے صحابی ملے مگر کوئی ایمان کے دس درجوں پر تو کوئی نو پر، کوئی آٹھ پر یعنی ایک ڈال موتی نہ تھے مگر کربلا ایک ایسا آئینہ خانہ تھا جس میں بہتر آئینوں میں صرف ایک تصویر تھی اور وہ تھی حضرت امام حسینؑ کی۔

طبیب روحانی امام حسینؑ کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اسلام ایک ایسے مریض کی مانند ہے جس کا دم لبوں پر ہو اور جس کی رگوں میں آلودہ خون دوڑ رہا تھا۔ ایسا مریض دو طرح سے ٹھیک ہو سکتا ہے یا موجودہ خون کو صاف کر دیا جائے یا نیا خون دیا جائے۔ حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور ابتدا میں امام حسینؑ کی یہی کوشش رہی کہ موجودہ خون کی ہی اصلاح ہو جائے لیکن جب یہ اصلاح ممکن نہ رہی تو امام حسینؑ نے فیصلہ کر لیا کہ اسلام کو زندہ رکھنے کے لئے اس کی رگوں میں نیا خون دوڑانا ہوگا۔ مریض کو وہی خون چڑھایا جا سکتا ہے جس کا بلڈ گروپ ایک ہو۔ کچھ مریضوں کا بلڈ گروپ کمیاب ہوتا ہے۔ امام حسینؑ نے عالم اسلام پر نظر ڈالی تو لاکھوں میں صرف بہتر نکلے۔

اس لئے راستہ میں ساتھ آئے لوگوں کو ہٹاتے گئے

اور صرف ان کو ساتھ رکھا جن کی رگوں میں تعلیمات اسلامی خون بن کر دوڑ رہی تھی اور انہیں کا خون اسلام کو حیات جاودانی عطا کر سکتا تھا۔ اگر امام حسینؑ اور اصحاب امام حسینؑ اسلام کے مردہ ہوتے ہوئے جسم میں اپنا خون نہ دیتے تو ظاہری اسلام تو ہوتا مگر روح اسلامی نہ ہوتی یعنی وہ اسلام رہ جاتا جس میں نماز تو ہوتی مگر اپنی بنائی ہوئی، روزہ تو ہوتا مگر خود پسند حدوں کے اندر، زکات ہوتی مگر تزکیۂ نفس نہ ہوتا، خمس تو ہوتا مگر درِ پنجتن سے الگ ہٹ کر، حج ہوتا مگر تجارت کے لئے، جہاد ہوتا مگر حصول دنیا کے لئے۔ حلال محمدؐ حرام ہوتا ہے اور حرام محمدؐ حلال اور اسلام کی وہی صورت ہوتی جیسی کہ دشمن اسلام چاہتے تھے۔

☆☆☆

اتحاد کا اعلان کیجئے

حضرت نجم آفندی

ملت کے تفرقہ کا نہ سامان کیجئے　　قرآن کے ورق نہ پریشان کیجئے
جاں دی تھی اتحاد کی خاطر حسینؑ نے　　پورا شہیدِ ظلم کا ارمان کیجئے
سرکارِ دو جہاں کی محبت کے نام پر　　آپس کے اختلاف کو قربان کیجئے
مرکز بنا کے آج حسینی نشان کو　　دنیا میں اتحاد کا اعلان کیجئے

حسینیۂ حضرت غفران مآبؒ میں بعد نماز مغربین عربی، فارسی، اردو اور دینیات کی تحصیل کے لئے اپنے بچوں کو ضرور بھیجیں۔

ادارہ

خطیب اعظم

خطیب منبر حسینی

علامہ عقیل الغروی صاحب قبلہ

خطابت: ایک مستقل صنف ادب ہے اور ''منبر'' ایک، مقام سخن، اور یہ کس قدر تاسف کی بات ہے کہ نہ اہل ادب میں شاعری اور نثر کے دوسرے مختلف اصناف کے مقابلہ میں خطابت پر کوئی خاص توجہ کی، نہ ہی عام طور پر سخنوروں نے ''فراز منبر'' کی صحیح شناخت کی اور دونوں گروہوں کی اکثریت۔ ''دار'' و ''فراز دار'' سے آگے نہ بڑھی حالانکہ، صلیب و دار کے استعارے اپنی حقیقتوں کے ساتھ کب کہنہ ہوئے بلکہ حلاج ناحق نعرۂ اناالحق سے جڑ کر ''سخن حق اور حق سخن'' کی راہ و روایت سے بیگانے ہوئے۔

خطابت واقعاً بجائے خود ایک مستقل صنف ادب ہی نہیں بلکہ ادبیات عالم میں موجود مختلف اسالیب اظہار میں سے ایک مخصوص اور منفرد اسلوب اظہار ہے۔ ایک ایسا اسلوب جو بیک وقت ''نثر'' سے کہیں زیادہ ''نثریت'' اور ''شعر'' سے کہیں زیادہ ''ارتکاز'' رکھتا ہے! اور یہ مخصوص اسلوب اظہار چاہے کسی سبب سے ادباء کی توجہ اپنی طرف زیادہ جلب نہ کرسکا ہو، لیکن کم بیش دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے اور اپنی ادبی اور فنی ماہیت کے اعتبار سے انتہائی دقیق بحث و بررسی کا مستحق ہے۔

''منبر'' وہ مقام سخن ہے جس کی اپنی ایک ذاتی صفت بلندی ہے اور وہ بھی ایک ایسی بلندی جس کو محض مکانی مفہوم میں تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ یہ بلندی ایک سیال معنوی حقیقت رکھتی ہے۔ یعنی یہ منبر کی اپنی ذاتی صفت ہونے کے باوجود اپنے اہل عناصر کی طرف منتقل بھی ہوتی ہے اور باتمام معنی منتقل ہوتی ہے یہ انتقال البتہ اہل عناصر کے درجۂ اہلبیتؑ کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

دنیا کی بے شمار مختلف زبانوں اور تہذیبوں میں عربی زبان اور ''ہاشمی ابراہیمی تہذیب'' نے خطابت و منبر کی تقریب سے انسانی ادبیات کو بالعموم اور اسلامی ادبیات کو بالخصوص خطات کی ایک اور خاص اور بسا بہتر و برتر صنف ''ذاکری'' سے روشناس کرایا۔ یہ وہ خطابت تھی۔ اور ہے جو منبر کی نشست اور ''وحی'' کی روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ ''عام خطابت'' کی بہ نسبت اس خاص خطابت کی اہمیت کا اندازہ اور تجزیہ اور بھی زیادہ سنجیدہ، عمیق اور وسیع مطالعہ کا مستحق ہے۔

یہ مختصر تقریب کلام خطابت، منبر یا ذاکری۔ ان میں سے کسی ایک سے متعلق بھی کسی فنی بحث و بررسی کی متحمل نہیں۔ یہ چند اشارات صرف خطیب منبر حسینی، خطیب آل محمدؐ، ملک الناطقین، فخر المتألہین شمس العلماء، مولانا سید سبط

حسن صاحب قبلہ جائسی ثم لکھنوی مرحوم و مغفور متخلص بہ ''فاطر'' کے ترجمۂ حیات کی تمہید کے طور پر پیش کئے گئے تا کہ قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ جب ابھی تک خطابت و ذاکری کے اصناف پر کما حقہ کام نہیں ہو سکا تو ان اصناف میں اپنا لوہا منوانے والوں کی صلاحیتوں، محنتوں اور ان کی عظمتوں کا اندازہ کہاں تک کیا جا سکتا ہے؟ اور پھر اس شخص کی ''عبقریت'' کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے جسے دنیا نے ''خطیب آل محمدؐ'' اور ''خطیب اعظم'' کے القاب سے نوازا۔

خطابت و ذاکری کی فنی ماہیت اور اس کے مشکلات سے قطع نظر خطابت کی عملی دشواریوں کا اندازہ کرنے اور بطور خاص منبر کی اہلیت کی ایک ذرا سی شناخت کے لئے عربی زبان کے چند مشہور علام کے بعض واقعات خطابت یا سانحات خطابت کا تذکرہ کافی ہوگا۔

جاحظ کی روایت ہے کہ عثمان منبر پر چڑھے (اور چڑھے کیا کہ آپ ہی اپنے چڑھنے کا سامنا کیا۔لرز گئے۔یا یہ کہ انہیں بولنا مشکل ہو گیا۔تو بس اتنا کہہ کر اتر آئے کہ۔حقیقت یہ ہے کہ ابوبکر و عمر اس مقام ''منبر'' کے لئے مقامات یا تقریریں تیار کیا کرتے تھے اور تم لوگ تو ایک امام خطیب کی بہ نسبت ایک امام عادل کے زیادہ محتاج ہو۔ اور عنقریب تمہارے سامنے اپنے انداز کے خطبے پیش کئے جائیں گے (گویا پوری تیاری کے ساتھ) اور پھر تم لوگ جان جاؤ گے۔(شاید اس آخری فقرے کا مطلب یہ ہو کہ پھر تم لوگ جان جاؤ گے کہ میں تیاری کے بعد کیسے خطبے سنا سکتا ہوں۔)

اسی طرح یعقوبی کا بیان ہے کہ جب ابو العباس سفاح کی بیعت ہوئی اور اس نے خطبہ دینا چاہا تو خطبہ دینا اس کے لئے دشوار ہو گیا اور اس کے بدلے اس کے چچا داؤد بن علی نے خطبہ دیا۔ابن ابی الحدید نے داؤد بن علی کے بھی اس موقع کے خطبہ کو صرف اس قدر نقل کیا ہے کہ اس نے کہا لوگو! امیر المومنین (کذا) تمہارے سامنے اپنے عمل سے پہلے اپنا قول پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتے اس لئے کہ عمل تمہارے اوپر خطبہ بیان کرنے سے زیادہ اثر انداز ہوگا۔اور تمہارے لئے کتاب خدا برائے علم کافی ہے اور رسولؐ خدا کے چچا کی اولاد تمہارے اوپر حکومت کے لئے کافی ہے۔

ان دونوں واقعات یا سانحات سے بھی شگفتہ تر واقعہ روح بن حاتم کا ہے، جسے ابوالحسن مدائنی نے نقل کیا ہے۔جب روح بن حاتم منبر پر گیا تو لوگوں نے دہشت اور تعجب کی نظر سے اسے گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا اور اس کی تقریر سننے کے لئے گوش بر آواز ہو گئے۔تو روح بن حاتم نے کہا: لوگو! اپنے سروں کو نیوڑھا لو اور اپنی آنکھیں جھکا لو اس لئے کہ منبر بڑی سخت سواری ہے۔(اب اس آخری فقرے پر کیا تبصرہ کیا جائے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ ''منبر ایک بڑی سخت سواری ہے۔۔۔'')

اس قسم کے واقعات دوسری زبانوں کی تاریخ خطابت میں بھی ضرور ہوں گے، لیکن عربی زبان کے حوالے صرف اس لئے پیش کئے گئے کہ دنیا کی دوسری قوموں اور زبانوں کی بہ نسبت عربی قوم ایک خاص صورت حال کی بنا پر

شاعری کے ساتھ ساتھ خطابت میں بھی تقریباً دوسری تمام قوموں پر فوقیت رکھتی ہے یہ خاص صورت حال کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا عربوں کی ایک امتیازی صفت اور نا قابل معذرت کمی اور کمزوری سے تشکیل پاتی ہے۔امتیازی صفت یہ کہ ''ناموس سخن'' سے بے حد کمال فطری مناسبت و وابستگی خصوصاً اس دور جو نزول قرآن سے شروع ہو کر اس کے ذرا بعد تک جاری رہتا ہے، جتنی عربوں کی نصیب میں آئی اتنی کسی دوسری قوم یا زبان والوں کے نصیب میں نہیں آئی۔دوسری طرف نا قابل معذرت کمی اور کمزوری اس قوم کے فن تحریر سے بالعموم ناواقفیت۔جو عین اسی دور میں نظر آتی ہے ان دونوں عوامل نے مل کر اس قوم کو اگر نثر نگاری کے میدان میں بہت پیچھے رکھا تو دوسری طرف شاعری اور خطابت کے میدان میں اس حد تک پہونچا دیا کہ دوسری قومیں اور دوسری زبان والے ان سے کہیں پیچھے رہ گئے۔آخر ''شعور سخن'' کی کسی نہ کسی صورت میں نمود تو ہونی ہی تھی۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے جس قوم کے فرد فرد میں شاعری اور خطابت فطری استعداد موجود تھیں اسی قوم میں ایسے سانحات خطابت اور پھر ایسے اعلام کے، کہ جن میں کچھ نہ سہی لیکن واقعاً ''جرأت رندانہ'' (ادبی اصطلاح میں شاید اس سے زیادہ کچھ نہ کہا جا سکے) تہور کی حد سے بھی سوا تھی، یہ اسی نکتہ کو پیش کرتے ہیں کہ خطابت کے فنی اور عملی عناصر، مسائل اور مشکلات واقعاً شاعری سے بھی پیچیدہ تر ہیں اور اس میدان کا مرد بننا چنداں آسان نہیں۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو ہندوستان کے گزشتہ مدرسۂ اجتہاد کے آخری ستون فقیہ اعظم مفتی احمد علی صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کا یہ قول صراحتاً مبالغہ ہونے کے باوجود کتنا واقعیت و حقیقت سے نزدیک معلوم ہوتا ہے کہ ''واقعہ تو یہ ہے کہ بنی آدم میں ایسا شخص پیدا نہیں ہوا'' اور ایسے شخص سے ان کی مراد تھی اسی شخصیت سے کہ جس برصغیر کے اسلامی مکتب فکر و مدرسۂ دانش و فرہنگ میں علی الاطلاق ''خطیب آل محمدؐ'' اور ''خطیب اعظم'' کے القاب سے جانا جاتا ہے۔یعنی شمس العلماء۔لسان المتألہین ملک الناطقین سید سبط حسن فاطر صاحب ''معراج الکلام''

حقیقت یہ ہے کہ جناب ''خطیب اعظم'' کی شخصیت ہند و سندھ کے اعلیٰ و ادبی افق پر ابھرنے والی وہ تحریر تھی جس کی علمی و فکری تہہ داری و تخلیقی و فنی پرکاری انتہائی عمیق اور وسیع مطالعہ و بررسی چاہتی ہے۔کاش! کوئی جیالا ان مغفور پر مستقل تحقیق کا بیڑا اٹھاتا اور لکھنؤ یونیورسٹی یا کسی بھی یونیورسٹی سے ان پر کوئی پی۔ایچ۔ڈی یا ڈیلٹ کا کام سامنے آتا۔

ان کا اصل وطن رئیس المتألہین سید الطائفہ آیۃ اللہ علی الاطلاق سید دلدار علی غفرانمآب طاب ثراہ صاحب ''عماد الاسلام'' کے وطن و مولد قصبہ نصیر آباد سے ملا ہوا قصبہ جائس (ضلع رائے بریلی) تھا اور ان دونوں بزرگوار کا جدی سلسلۂ نسب ایک ہی تھا (رحمہما اللہ) ان کے والد کا نام سید وارث حسین نقوی تھا۔۱۲۹۶ھ میں جائس میں ولادت ہوئی اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی کہ اہل خاندان اور اہل قصبہ بجائے خاصے بافضل تھے۔پھر

تکمیل علم کے لئے لکھنؤ کا رخ کیا ؎

فروغ طبع خدا داد اگرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسب فن کے لئے

کے بمصداق اس وقت کے فحول علماء آیۃ اللہ مؤسس نجم الملۃ والدّین سید نجم الحسن صاحب قبلہ الرضوی الامروہوی ثم الکھنوی۔ اور فقیہ اہل بیتؑ مرجع کبیر آیۃ اللہ العظمیٰ سید باقر صاحب قبلہ اور اس وقت کے دیگر اساتذہ سے کسب فیض کیا اور خود اپنے اساتذہ کی نظر میں وہ مقام پیدا کیا کہ جب آیۃ اللہ مؤسس جناب نجم الملت صاحب طاب ثراہ نے ''مدرسۃ الواعظین'' کی تاسیس وتشکیل فرمائی تو انہیں اس کا صدر مدرس قرار دیا۔

اگرچہ بالآخر ان کی شہرت ان کی خطابت یا پھر شاعری اور دوسری ادبی حیثیتوں سے باقی رہی لیکن ان کے تعلیمی مرحلہ زندگی کے تذکرہ میں ایک واقعہ ایسا ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبع داری نے تعلیمی مرحلہ میں ہی فقہ واصول فقہ کے میدانوں میں بھی ایک خاص امتیاز عطا کر دیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ زمانہ لکھنؤ کے مدارس کا وہ تھا کہ جس میں آخری درجات یعنی ممتاز الافاضل وصدر الافاضل کے امتحانات کے پرچے اساتذۂ حوزہ علمیہ نجف بنا کر بھیجا کرتے تھے اور امتحانات کی کاپیاں بھی شبر واختبار کے لئے وہیں جایا کرتی تھیں ''خطیب آل محمدؐ'' کے مصنف کا بیان ہے کہ جب جناب سبط حسن صاحب قبلہ کے اصول وفقہ کی کاپیاں نجف پہونچیں تو وہاں ممتحن نے ان کے جوابات اپنی مجلس درس میں پڑھ کر سنائے اور اپنے شاگردوں کو ویسی استعداد پیدا کرنے کی ترغیب دلائی حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ معمولی نہیں۔

بطور خاص ان کی خطابت کے تعلق سے اس مختصر تقریب کلام میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ خطابت کے عام فنی عناصر اور علمی وعملی لوازم کے ساتھ بظاہر ان کے یہاں پانچ عناصر مستزاد تھے۔

۱۔ عربی شعر وادب کے وسیع مطالعہ سے تشکیل پانے والا ان کا خاص ذوق اور زاویۂ نظر جو آیات قرآن مجید اور ارشادات معصومینؑ کے ترجمہ وتجزیہ میں عام مترجمین وشارحین کی بہ نسبت کہیں زیادہ افادات پیش کرتا تھا۔

۲۔ اردو زبان پر ان کا خلاقانہ تصرف جو ان کے افادات کو خاص وعام ہر طبقہ کے ان کے سامعین کو ہر طرح مطمئن اور محظوظ کرتا تھا۔

۳۔ فلسفہ وکلام واصول فقہ کے اسالیب بحث پر ان کا تسلط جو ان کے افادات (یا نکتوں) کو علمی اور فکری معیار سے گرنے نہیں دیتا تھا۔

۴۔ مطالب کی ادائیگی میں الفاظ ومعنی کے بیشتر مناسبات کا لحاظ رکھتے ہوئے لہجے اور اشارات کے زیر وبم سے نامحسوس کو محسوس بنا دینے والا ان کا اپنا انداز خطابت۔

۵۔ اور سب سے اہم اور سب سے موثر عنصر ''منبر حسینیؑ'' کی عظمت کا احساس اور اس سے ان کا خلوص۔ جیسے کسی بھی ''ذاکر'' کی کامیابی کی پہلی اور آخری شرط سمجھنا چاہئے۔

☆☆☆

اردو کا اُمّی مرثیہ گو

سید صادق علی نقوی ''چھنگا صاحب'' حسینؔ جائسی مرحوم

سید مصطفی حسین نقوی اسیفؔ جائسی

دادھیالی سلسلۂ نسب:۔

سید صادق علی حسینؔ بن میر حسن بن سید سجاد حسین (رئیسِ جائس) بن سید شیر علی بن سید مکرم علی بن سید محمد ولی بن سید حسین بن حبیب اللہ معروف بہ شیر علی بن عبدالجلیل بن سید شہاب الدین بن سید قاسم بن سید پیارہ حسینی بن سید سعد اللہ بن سید ماہرو بن سید شہاب الدین بن سید علی عرف سید بھیکہ بن سید جلال الدین بن سید عمر علی بن سید علیم الدین بن سید علم الدین بن اشرف الملک سید شرف الدین (حاکمِ جائس) بن نواب نجم الملک سید نجم الدین سبزواری (فاتح جائسی)۔

ننھیالی سلسلۂ نسب:۔

سید صادق علی حسینؔ بن باقری بیگم بنت صغریٰ بیگم بنت مولانا سید صادق صاحب بن سلطان العلماء آقا السید محمد بن حضرت سید دلدار علی غفرانمآبؒ۔

ولادت:۔

چھنگا صاحب حسینؔ ۱۲۹۱ھ کو اپنے نانا کے گھر سبزی منڈی لکھنؤ میں متولد ہوئے۔

تعلیم:۔

آپ بالکل انپڑھ تھے، نام تک نہ لکھ سکتے تھے۔ مجلس میں مرثیہ خوانی کے وقت کوئی مرثیہ الٹا سیدھا ہاتھ میں لے لیتے تھے اور محض اپنی زبردست قوتِ حافظہ کی مدد سے پڑھتے تھے۔ حسینؔ ان چند شعراء میں تھے جن کو قدرت نے شاعر پیدا کیا تھا۔

شاعری:۔

شاعری کی طرف آپ ۱۳۰۸ھ میں متوجہ ہوئے، آپ نے سب سے پہلے ایک نوحہ کہا پھر غزلیں کہنا شروع کیں پھر مرثیہ کہنے کا خیال پیدا ہوا تقریباً تیس سال مرثیہ گوئی کی۔ بچپن میں آپ کا قیام عراق میں تھا جس کے سبب سے آپ فارسی و عربی نہ صرف سمجھ لیتے تھے بلکہ بول بھی لیتے تھے۔

آپ کی شادی خانہ آبادی، نواب مولوی سید مہدی حسین ماہرؔ لکھنوی (بن سید علی حسین بن سید العلماء سید حسن علیین مکان بن حضرت غفرانمآبؒ) کی دختر نیک اختر سے ہوئی اور اس طرح ماہرؔ لکھنوی مرحوم آپ کے خسر اور سید محمد اصطفا صاحب خورشیدؔ لکھنوی آپ کے برادر نسبتی اور آپ لسان الشعراء سید مجاور حسین تمنّاؔ کے بڑے بھائی تھے۔ آپ کی خواہر عابدہ بیگم کی شادی ملک الشعراء سید بندہ کاظم جاویدؔ

لکھنوی (بن مولوی محمد جعفر امید لکھنوی بن منصف الدولہ شریف الملک مولانا سید محمد باقر بن سلطان العلماء بن غفرانمآبؒ) سے ہوئی ۔اس طرح چھنگا صاحب کے چاروں طرف علمی وادبی ماحول تھا جس میں ان کے فطری فن کو خوب ترقی کرنے کا موقع ہاتھ لگا۔

آپ کا ذریعۂ معاش کسی طرح کی محض ایک قلیل پینشن تھی۔ آخری عمر بڑی عسرت سے بسر کی لیکن خودداری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ آپ کا قیام پاٹے نالے پر تھا۔ مرتے وقت کثیر اولاد میں صرف دو بیٹیاں چھوڑیں۔

۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۴۰ء کو ساٹھ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی اور حسینیۂ غفرانمآبؒ کے صحن میں پیوند خاک ہوئے۔

حسینؔ صاحب جاوید لکھنوی کے شاگرد تھے۔ بحیثیت غزل گو حسینؔ کا شمار خوش گو شعراء میں تھا لیکن اصل میں وہ مرثیہ نگار تھے لہٰذا زیادہ زمانہ مرثیہ گوئی کے لئے وقف رہا۔ مرثیہ ہی وہ صنف ہے جس میں مرزا غالبؔ دہلوی مرحوم عاجز نظر آتے ہیں اور ان کے مرثیہ کے چند بند واسوخت بن کر رہ جاتے ہیں۔ جناب دولہا صاحب عروجؔ نے بھری مجلس میں حسینؔ صاحب کے متعلق فرمایا تھا کہ تم فخر ہندوستان ہو، اور اس میں ذرا شک وشبہہ نہیں کہ بحیثیت ایک امی مرثیہ گو کے وہ اردو اور ہندوستان کے لئے سرمایۂ افتخار تھے۔ چھنگا صاحب نے اردو کی طرح فارسی میں بھی شاعری کی ہے۔ مرحوم کے تقریباً چالیس مرثیے، غزلوں، سلاموں اور نوحوں کے مجموعے ساتھ ہی فارسی کلام بھی آپ کے برادر فردوسید مجاور حسین تمنؔا کے پاس محفوظ تھے جن کا اب حال نہیں معلوم۔

(تمنؔا بڑی خوبیوں کے مالک اور صاحب معلومات شاعر تھے ان کا صرف ایک شعر ملاحظہ فرما کر ان کی بلندئ فکر کے سلسلے میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ؎

کہیں سے تم کہیں پہونچو گے اشکوں کی روانی میں
تمنؔا گھر سے کیوں نکلے ہو اس آفت کے پانی میں)

مہذب لکھنوی صاحب ''اذکار محن'' میں ''حیات حسین'' کے ذیل میں تحریر کرتے ہیں۔ ''سید صادق علی عرف چھنگا صاحب حسینؔ مرحوم دیگر اصناف سخن میں بھی ماہر تھے لیکن مرثیے کی طرف ان کو خاص طور سے توجہ تھی۔''

حسینؔ مرحوم نہایت خوشگوار شاعر تھے مولوی بندہ کاظم صاحب جاویدؔ مرحوم ان کے بہنوئی تھے اور وہ انہیں سے اصلاح لیتے تھے۔ استاد کی شفقت اور اپنی طبیعت داری کی بدولت غزل اور مرثیہ دونوں میں مہارت حاصل ہوگئی، اختصار کے پیش نظر صرف ایک شعر غزل کا ملاحظہ ہو جس سے ان کے زور طبیعت کا اندازہ ہو جائے گا۔ ؎

کھینچا ہے جو ناوک تو سرک جاؤ ادھر سے
اب کون نہیں آگ نکلتی ہے جگر سے

غرض غزلیں بہت کہیں اور بہت خوب کہی ہیں لیکن مرثیہ غزل سے کہیں زیادہ مشکل چیز تھا مگر مرثیے بھی ایسے کہے کہ جب لوگ خود سنتے تھے تو بیحد محظوظ ہوتے تھے اور آج بھی ان کا مطالعہ تعجب ودلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

''اسرار محن'' میں مہذبؔ صاحب لکھتے ہیں کہ

''قدرت کا منظور نظر غیر معمولی انسان لکھنؤ کی سرزمین پر ایک ایسا باکمال گزرا ہے جس کا نام سید صادق علی عرف چھنگا تھا۔''

یہ بزرگ خاندان اجتہاد کی ایک فرد تھے مگر بالکل ان پڑھ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا دوسروں سے اپنا مرثیہ لکھواتے تھے اور منبروں پر دوسروں کی مدد سے پڑھتے تھے۔

''لکھنؤ کے امی شعراء'' میں حیدر حسین فضاؔ لکھتے ہیں کہ ''راقم الحروف'' کے استاد مرحوم و مغفور علامہ پرتوؔ لکھنوی نے تحریر فرمایا ہیکہ ''ایک وقت لکھنؤ کا یہ ماحول تھا کہ سید صادق علی عرف چھنگا صاحب حسینؔ لکھنوی حرف شناس بھی نہ تھے لیکن ذہن و حافظہ بلا کا پایا تھا حسنِ فکر کی نسبت سے حسینؔ اس پر جناب جاویدؔ لکھنوی کی اصلاح وتربیت نے حسن کلام بھی پیدا کر کے مکمل حسین بنا دیا۔ مرثیہ خود کہتے تھے اور لکھتا کوئی دوسرا تھا مجلس میں اپنا مرثیہ خود پڑھتے تھے میں خود ان کی مجلسوں میں شریک ہوا ہوں۔

حسینؔ منبر پر، مرثیہ ہاتھ میں، ایک شخص قریب منبر ایستادہ تھا اس نے شروع کا ایک لفظ چپکے سے بتایا اور حسینؔ اس سلسلے کے پورے بند ٹھاٹھ کے ساتھ پڑھ گئے، یوں ہی مرثیہ تمام ہوتا تھا۔ داد کا ہمہمہ بھی ہوتا تھا اور شور گریہ بھی۔ ان کے مرثیے کو دیکھکر کوئی یقین نہیں کرسکتا کہ یہ شخص قطعاً بے پڑھا تھا۔ نزاکت تخیل، شستگیٔ زبان، الفاظ کا استعمال برمحل، بندشوں میں روانی سبھی کچھ تو ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کلام ایک امی محض شاعر کا ہے۔

مہذبؔ صاحب فرماتے ہیں کہ ''جو کچھ کہا ایسا کہ بڑے بڑے خوشگویان کے دانت کھٹے کردیئے۔ اہلِ ذوق نے آج تک دنیا کی چیزیں دیکھی اور سنی ہوں گی مگر جاڑ انظماً نہ دیکھا ہوگا۔

پہلی ہستی ہے جس نے جاڑے کے متعلق ایسی بلند پروازی کی ہے اور وہ نازک خیالات جمع کئے جس کی داد کماحقہٗ نہیں دی جاسکتی۔

☆☆☆

نمونۂ کلام

ناظرین کرام امی شاعر کا زور بیان ملاحظہ فرمائیں

غزلیات

وقتِ زینت دور رکھا کر ستمگر آئینہ
حسنِ عالم سوز سے چٹکا ہے اکثر آئینہ

کھلا رہنے دو منھ میرا کفن سے کیوں چھپاتے ہو
سنا ہے وہ جنازے کے برابر ہو کے نکلیں گے

زخم کھولے ہیں اگر آنکھ تو بیزار نہ ہو
یہ نئی ضد کہ کوئی طالبِ دیدار نہ ہو

حال قیدی کا نہ ہو دیکھنے والا کوئی
آنکھ کھولے ہوئے گرروزنِ دیوار نہ ہو

کہتی ہے بلبل کہ دیکھئے کوئی حدّشوقِ دید
شاخ پر کب ہے مرے تار نظر پر پھول ہے

میرے آنسو کی دو رنگی دیکھ کر کہتے ہیں وہ
آنکھ میں موتی ہے اور دامن میں گر کر پھول ہے

رباعی

منکر ہو جہاں میں اس کا کیوں کر کوئی
ڈھونڈے سے ملے نہ جس کا ہمسر کوئی

میزانِ خرد میں ہم نے تولا سو بار
لیکن نہ ملا نبیؐ سے بہتر کوئی

سلام

پڑے ہیں عرش کے ٹوٹے ستارے ضوفشاں ہوکر
زمینِ کربلا چمکے گی اب تو آسماں ہوکر

ہوائے تیغِ عباسؑ جری کا تیز دھارا ہے
پھریرے فوجِ اعدا کے اڑیں گے دھجیاں ہوکر

شبِ معراج ہے ہیں عاشق و معشوق میں باتیں
قیامت کر رہا ہے آج پردہ درمیاں ہوکر

کھلا بعدِ ولادت مرتضیٰؑ کے چشم و ابرو سے
یہی اک روز بت کعبے میں توڑیں گے جواں ہوکر

پیا ہے ناریوں کا خوں بڑھی ہے آب میں گرمی
ابھر آئے ہیں جوہر تیغ کے سب مچھلیاں ہوکر

گئے باغِ جناں میں ظہر تک جن جن کو جانا تھا
کھڑے ہیں شہ اکیلے یوسفِ بے کارواں ہوکر

چلے ہیں لے کے یہ کہتے ہوئے شبیرؑ خیمے سے　　بعینہ مرتضیؑ ہوتے علی اصغرؑ جواں ہوکر
کہاشہ نے کہ اصغرؑ حجتِ ناطق کا پوتا ہے　　سوال آب اعدا سے کرے گا بے زباں ہوکر
حسینؑ نقشِ قدم پر کاملوں کے پاؤں رکھتے ہو　　چلے ہو پیچھے پیچھے تم بھی گردِکارواں ہوکر

سلام

برا ہے حرص زر میں بندۂ اغیار ہوجانا　　یہ کافی ہے غلامِ حیدر کرار ہوجانا
صراط اک پل ہے اے ایمان والوخوف کیا اس کا　　علیؑ سے ناخدا کانام لے کر پار ہوجانا
کہا بنت علیؑ نے دے کے رخصت دونوں بیٹوں کو　　وغا میں تم علی تم جعفر طیار ہوجانا
لڑائی میں نصیحت عون کی تھی یہ محمد سے　　جہاں گھِرنا وہاں چلتی ہوئی تلوار ہو جانا
گلے پر تیر کھا کر مسکرائے مرحبا اصغرؑ　　یہ سن اور یوں فدائے سید ابرار ہوجانا
نکیرین آچکے ہیں مرتضیؑ بھی آنے والے ہیں　　ذرا قبر حسینؑ اب مطلعِ انوار ہوجانا

سلام

کمسنی میں کیا جری تھے زینبِ مضطر کے لال　　ہاتھ سے تیغیں نہ چھوڑیں دم میں جب تک دم رہا
فاطمہؑ تھیں سب کے آگے بال بکھرائے ہوئے　　تشنہ کاموں کا بپا کوثر پہ یوں ماتم رہا
کانپتے ہاتھوں سے ناوک کھینچ کر شاہِ ہدیٰ　　دل سے لپٹائے رہے اصغرؑ میں جب تک دم رہا
کون کہتا ہے کہ لاشیں رن میں عریاں ہوگئیں　　خوں کفن بن کر شہیدوں کے تنوں پر جم رہا

☆☆☆

روزِ عاشورہ کی گرمی کا تھا شب تک یہ اثر　　خاک کے ذرے چراغِ قبر اصغرؑ ہوگئے
چشمِ عباسؑ جری سے جو گرے تھے بحر میں　　اشکِ وہ بطن صدف میں جا کے گوہر ہوگئے

مرثیہ کے چند بند
جن میں شمشیرِ آبدار کی شرر باریاں دکھائی گئی ہیں

تیغیں کھنچنے لگیں ترکش سے نکلنے لگے تیر　سپریں ہتواس کے تیار ہوئے سب بے پیر
نیزے اونچے ہوئے تادور بیاباں میں کثیر　چمکے چار آئینے وہ صاف جو تھے برق نظیر

ہرطرف گردِ بیابان بلا اٹھی ہے
خوں کا مینہ برسے گا ڈھالوں کی گھٹا اٹھی ہے

یک بیک غل ہوا عباسؑ کی تلوار کھنچی　میان سے تیغ پئے لشکرِ کفار کھنچی
روشنی ہو گئی جب صاعقہ کردار کھنچی　دل لرزنے لگے وہ تیغِ شرربار کھنچی

فیصلہ کرنے کو اب بیچ میں کیوں ڈھال پڑے
اس کی جھنکار سے چار آئینوں میں بال پڑے

حسن حوروں میں کہاں یہ جو اسے حور کہوں　خیرہ ہوتی ہے نظر پاس کہوں دور کہوں
ہوجو کاٹھی میں تو برقِ شبِ دیجور کہوں　دل یہ کہتا ہے اسے شمعِ سرطور کہوں

بے خبر کو بھی تجلی کی خبر ہوتی ہے
خطِ ابیض ہوا ظاہر کہ سحر ہوتی ہے

جوہروں سے ہے یہ پیدا کہ ہے میناکاری　اور قبضہ پہ جواہر کی سجاوٹ ساری
یا پری نکلی ہے پوشاک پہن کر بھاری　روشنی اس کی ہو گر رات بھی ہو اندھیاری

یوں ہی آثارِ سحر ہوتے ہی اختر ڈوبے
جیسے آب دم شمشیر میں جوہر ڈوبے

تیغ آیت ہے تو ہیں اس کے معانی جوہر	آگ بنتے ہیں کبھی اور کبھی پانی جوہر
ہیں کہیں ہلکے گلابی کہیں دھانی جوہر	آب میں اپنی دکھاتے ہیں جوانی جوہر

خوبیاں جوہروں کی صاف نظر آئی ہیں
مچھلیاں تیغ کے پانی پہ ابھر آئی ہیں

موسم سرما کی تصویر کشی

فصل ایسی ہے کہ سردی کا زمانہ آخر	کہرا پڑنے سے نہیں دھوپ بھی ہوتی ظاہر
برف باری سے نشیمن میں ہیں پنہاں طائر	زمزمہ کرنے سے بلبل کی زباں ہے قاصر

دھیان آتا ہے تو بلبل کے جگر کانپتے ہیں
ایسی ٹھنڈی ہے ہوا جس سے شجر کانپتے ہیں

برف باری سے بیاباں کا ہے سبزہ پامال	پالا کھانے سے ہیں ٹھٹھرے ہوئے جنگل میں
اوس میں بھیگ کے شبنم کا برا ہے احوال	نہال پھل ہے جو باغ میں اس پہ بھی فالج کا خیال

گر بشر کھائیں ہوا واں کی تو ہوں تن نیلے
آج تک ہیں اسی دن سے لب سوسن نیلے

اوس پڑنے سے ہے بھیگی ہوئی صحرا کی زمیں	طائروں کو بھی برودت سے کہیں چین نہیں
انقلاب ایسا نہ آیا ہے تہہ چرخ بریں	بلبلیں بیٹھی ہیں لالے کی انگیٹھی کے قریں

بال و پر اوس سے بھیگے ہوں تو راحت کیسی
آتشِ گل میں برودت ہے حرارت کیسی

حکماء کو بھی ہے اب مہر کی حدت میں کلام | دھوپ بھی چاندنی کی طرح سے دیتی نہیں کام
بر د اطراف بیاباں کی زمیں کو ہے تمام | سر کھلے رہتے ہیں فواروں کو کیوں ہو نہ زکام

آب میں تھی جو روانی وہ تھمی جاتی ہے
دھار ہر ایک برودت سے جمی جاتی ہے

جام بلّور بعینہ ہوا ہر ایک حباب | مچھلیاں پانی کے جمنے سے پھنسی ہیں تہِ آب
ہیں شکنجے میں تو جنبش نہیں کھاتے گرداب | دانت بجتے ہیں گہر کے نہیں سردی کی جوتاب

جو حباب آب میں ہے غنچۂ سربستہ ہے
اس پہ کیا آج تلک آب گہر بستہ ہے

کیا بیاں کیجئے اللہ رے سردی کا اثر | وہی ٹھٹھرے ہوئے تھے جو کہ لب جو تھے شجر
ہے حبابوں کا یہ عالم کہ اٹھاتے نہیں سر | چادرِ آب میں لپٹے ہوئے بے حس ہیں مگر

پانی جم جانے سے موجہ تو کہاں اٹھتا ہے
منھ سے گرداب کے ہر بار دھواں اٹھتا ہے

برف اس حد کی گری ہے کہ وہ صحرا ہے سفید | کوہِ اسود تھا جو پہلے وہی سارا ہے سفید
منزلوں دیکھئے میدان میں سبزا ہے سفید | سنگِ مرمر کی طرح سامنے دریا ہے سفید

پانی جمنے سے سمندر میں کہاں جوش ہے آج
جو شجر بن میں ہے۔گویا وہ کفن پوش ہے آج

قرآن کا فلسفۂ تاریخ

آیۃ اللہ شہید السید باقر الصدرؒ
ترجمہ مولانا سید محمد ظفر حسینی صاحب

اس عنوان کے تحت بحث کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم جس موضوع کا انتخاب کر رہے ہیں وہ ہے ''قرآن کریم میں تاریخ کے اصول وضوابط''۔ اس سلسلے میں جو سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں، یوں ہیں:۔کیا قرآن کریم میں بشری تاریخ کے کچھ اصول وضوابط پائے جاتے ہیں؟۔کیا تاریخ انسانی کچھ ایسے قوانین کی حامل ہے جو اسکے ارتقائی سفر پر حاکم ہوں؟۔وہ کون سے اصول وضوابط ہیں بشری تاریخ جن کی گرفت میں ہے؟۔تاریخ انسان کا آغاز کیونکر ہوا؟۔اس کی نشو ونما کس طرح ہوئی؟۔اس نے اپنا ارتقائی سفر کیسے طے کیا؟۔نظریۂ تاریخ کے بنیادی اسباب کیا ہے؟۔عملیۂ تاریخ میں انسان کا کیا کردار ہے؟۔ عالم بشریت میں آسمان یا نبوت ورسالت کے کیا نقوش واثرات ہیں؟۔ یہ وہ تمام سوالات ہیں جن سے مذکورہ بالا موضوع یعنی ''قرآن میں تاریخ کے اصول وضوابط'' اسی کے تحت ہمیں بحث کرنا ہے، اور یہ قرآن کا وہ رخ ہے جو مختلف زاویوں اور عنوانات سے سہی لیکن قرآن کریم کے بیشتر حصوں میں زیر بحث آیا ہے، مثال کے طور پر انبیاء علیہم السلام کے قصوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو اس قرآنی پہلو کے عظیم جزو کی نمائندگی کرتے ہیں، انبیاء کرام کے قصے تاریخی نقطۂ نظر سے زیر بحث آئے ہیں، جن سے مورخین نے مکمل استفادہ کیا ہے اور ان تمام واقعات وحوادث سے متعرض ہوئے ہیں۔جنہیں قرآن کریم نے بیان کیا ہے اور جب انھوں نے کہیں پر کوئی ایسا خلا محسوس کیا ہے جسے قرآن نے پر نہیں کیا ہے تو انھوں نے اسے روایت و احادیث کے ذریعہ پر کرنے کی کوشش کی ہے یا جو کچھ گذشتہ مذاہب کی کتابوں میں نقل ہوا ہے اس سے خلا کو بھرنا چاہا ہے اور یا جھوٹی داستانوں اور خرافات کے ذریعہ اسے ختم کرنے کی سعی کی ہے جس کے نتیجہ میں اس قرآنی پہلو کے نظم وترتیب کی غرض سے تاریخ سے متعلق دفتر کے دفتر معرض وجود میں آگئے ہیں۔

اسی صورت قرآن میں اس پہلو پر ایک اور زاویہ یعنی قرآن کے اسلوب داستان نگاری کے نقطۂ نظر سے بھی بحث ہوئی ہے، نیز یہ کہ یہ قرآنی اسلوب حقیقت وواقعیت، قدرت بیان اور ندرت کلام کے جوہروں سے کس حد تک آراستہ ہے، قرآنی قصے حیاتی پہلوؤں اور تحرک بخش واقعات آفریں عناصر کی دولت سے کتنے زیادہ مالا مال ہیں؟۔ یہ بھی چند ایسے گوشے ہیں جن پر گذشتہ موضوع کے تحت بحث ناگزیر ہے، نیز ان کے علاوہ بھی قابل بحث کچھ او

رموضوعات ہیں، لیکن ہم فی الحال مذکورہ عنوان کے تحت جس زاویہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ۔ ''اس گوشہ سے تاریخ کے اصول وضوابط پر اس حد تک روشنی پڑتی ہے'' تاریخ اصول وضوابط سے ہماری مراد وہ قوانین وحدود ہیں جو حرکت تاریخ میں مکمل طور پر کارفرما ہیں بشرطیکہ قرآن نے اس طرح کے اصول وضوابط اور قوانین وحدود کا کوئی تصور ہمیں عطا کیا ہو۔

دوسرے علوم وفنون کی مانند تاریخ کی دنیا میں بھی ہمیں کچھ موجودات وظواہر نظر آتے ہیں جس طرح فلکیات و طبیعات وغیرہ کے میدانوں میں کچھ ظواہر ملتے ہیں اسی صورت تاریخی میدان میں بھی۔ جس کی توضیح وتشریح مخصوص معنوں میں ہم عنقریب تاریخ ہی سے پیش کریں، موجودات وظواہر کی ایک تعداد نظر آتی ہے اور جس طرح دیگر میدانوں میں ان موجودات وظواہر کے لئے کچھ اصول وضوابط اور قوانین وحدود معین ہیں اسی صورت ہمیں یہ دریافت کرنے کا حق حاصل ہے کہ تاریخی میدان میں پائے جانے والے ظواہر بھی کچھ اصول وضوابط کے حامل ہیں یا نہیں؟ ان اصول وضوابط اور قوانین وحدود کے بارے میں قرآن کریم کا موقف کیا ہے؟ اور قرآن نے ان کے متعلق مثبت یا منفی انداز میں، مجمل یا مفصل طور پر کس نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے؟

بعض لوگ اس وہم کے شکار ہیں کہ ہمیں۔ یہ توقع وابسطہ نہیں کرنا چاہئے ''قرآن کریم میں تاریخ کے اصول و ضوابط جیسے موضوع پر کوئی بحث موجود ہوگی، کیوں کہ طبیعات، ایٹم اور نباتیات وغیرہ کے قواعد وضوابط کے مانند، تاریخ کے اصول وضوابط کا مسئلہ بھی ایک علمی مسئلہ ہے اور قرآن اکتشافات واختراعات کی کتاب کی حیثیت سے نازل نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت کتاب رشد وہدایت کی ہے۔ قرآن کسی درسی کتاب کی شکل میں نہیں آیا ہے اور رسول اللہ پر ایک معلم کے عنوان سے نہیں نازل ہوا ہے ان معنوں میں کہ جس طرح شاگرد کے لئے استاد کی باتیں لائق تقلید وعمل ہوتی ہیں، اسی صورت قرآن کا وجود بھی ایک استاد کا ہے، تاکہ وہ ماہر علوم اور متمدن وتہذیب یافتہ لوگوں کے ایک گروہ کا معلم ومربی ہو بلکہ یہ کتاب صرف اس لئے نازل ہوئی ہے کہ لوگوں کو گمراہی اور جاہلیت کے اندھیروں سے نکال کر رشد و ہدایت اور اسلام کے اجالوں میں لے آئے، لہٰذا اسے محض کتاب اصلاح وہدایت کہا جا سکتا ہے نہ یہ کہ اکتشافات واختراعات کی کتاب تصور کی جائے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیں قطعاً یہ امید نہیں رکھنا چاہئے کہ قرآن دیگر علوم وفنون سے متعلق کسی قسم کے حقائق و معارف اور ان کے بنیادی قواعد و ضوابط کے بارے میں کوئی نظریہ پیش کریگا۔ یا طبیعات، کیمیا اور نباتات وحیوانات وغیرہ جیسے موضوع پر کوئی بحث وتبصرہ کرے گا۔ البتہ ہمیں یہ تسلیم ہیکہ ان تمام علوم وفنون کی طرف قرآن میں اشارات ضرور موجود ہیں، لیکن یہ اشارات بس اسی حد تک ملتے ہیں جس حد تک قرآن کے ان ہی پہلو (اثبات الوہیت کے مسئلے) پر روشنی پڑ سکے اور اس الٰہی کتاب کا ربانی رخ سامنے آسکے۔ ایک ایسی کتاب۔ جو ماضی، حال اور مستقبل کے تمام حالات کا اپنے دامن میں

احاطہ کئے ہوئے ہے، جس کو گوناگوں علوم وفنون کے مختلف میدانوں میں، انسانی تجربیات و انکشافات پر علمی حقائق و معارف اور بے شمار رازہائے سربستہ کے چہروں سے نقاب کشائی کے سلسلے میں صدیوں کی سبقت و اولیت حاصل ہے، لیکن یہ قرآنی اشارات وکنایات ان ہی علمی اغراض و مقاصد کے تحت ہیں جن کا ابھی تذکرہ ہوا ہے نہ یہ کہ ان کا مقصد فزیکس اور کیمسٹری وغیرہ کی تعلیم دینا ہو۔ قرآن، انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کی جگہ خود نہیں لینا چاہتا ہے اور نہ اس کی خداداد لیاقتوں اور صلاحیتوں کو تلاش اور ریسرچ سے ذرا بھی باز رکھنا چاہتا ہے۔ خواہ وہ زندگی کے شعبوں میں سے کسی بھی شعبۂ حیات میں تلاش اور ریسرچ کا مسئلہ ہو، جس کا ایک جز و تجربیات و مشاہدات اور موجودات سے آشنائی بھی ہے، چنانچہ قرآن نے کبھی بھی ان امور کی جگہ خود نہیں لینا چاہی، بلکہ خود کو ایک ایسی روحانی اور معنوی طاقت کے عنوان سے پیش کیا ہے جس کا کام انسان کی ہدایت و رہنمائی، اس کی خوابیدہ طاقتوں کو بروئے کار لانا، زندگی کے سچے راستے پر اسے گامزن کرنا اور ولولہ و تحرک عطا کرنا ہے۔

غرض کہ یہ بات جب تسلیم شدہ ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کا فریضہ لوگوں کی ہدایت و رہنمائی ہے اور وہ اکتشافات و اختراعات کی کتاب نہیں ہے تو اب ہمارے لئے اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے کہ ہم یہ بے جا توقع رکھیں کہ قرآن ان تمام علوم وفنون سے متعرض ہو جن کے اصول وضوابط کی تعیین وحد بندی اور قوانین وحدود طے کرنا انسانی فہم و دماغ کا کام ہے۔ ہم کیوں بلا وجہ منتظر رہیں کہ قرآن علوم وفنون کے بنیادی اصول کی نشاندہی کرے گا اور اس سلسلے میں اپنے نظریات بیان کرے گا؟ یا کائنات کے بے شمار شعبوں اور میدانوں میں سے صرف شعبۂ تاریخ میں اس کے اصول وضوابط سے متعلق کوئی علمی مفہوم ہمارے سامنے پیش کرے گا؟ جبکہ دیگر شعبوں میں قرآن نے اس طرح کی کوئی روش نہیں اپنائی ہے، اور اس سلسلے میں قرآن پر کوئی اعتراض بھی وارد نہیں ہوسکتا کہ وہ دیگر میدانوں میں اس قسم کے رویہ کا حامل کیوں نہیں ہے؟ کیونکہ اگر ان اصول وضوابط اور قواعد وقوانین کی نشاندہی اور حقائق و معارف کی نقاب کشائی کی ذمہ داری قرآن کے دوش پر ہوئی تو اس کتاب کی نوعیت بھی کچھ اور ہی ہوتی۔ پھر یہ پوری دنیائے بشریت کے فائدے اور مقصد کی کتاب نہ رہ جاتا بلکہ علوم وفنون کے ماہر طبقہ کی مخصوص کتاب ہوجاتی جسے ایک درسی اور نصاب کی کتاب کے عنوان سے مخصوص گروہوں، شعبوں اور حلقوں میں پڑھا جاتا۔

ہمارے اختیار کردہ موضوع سے متعلق بعض افراد کے یہ چند اعتراضات ہیں اور باوجودیکہ کسی حد تک یہ اعتراضات بجا اور درست ہیں یعنی قرآن اکتشافات و اختراعات کی کتاب نہیں ہے، وہ انسان کی ارتقائی طاقتوں، ایجاد واختراع کی قوتوں اور تلاش اور ریسرچ کی صلاحیتوں کو زنگ آلود نہیں بنانا چاہتا ہے، بلکہ وہ رشد وہدایت کی کتاب ہے، اس کے باوجود ہمیں تاریخ اور دنیا کے دیگر علوم وفنون کے درمیان ایک بنیادی فرق نظر آتا ہے اور یہی وہ بنیادی

فرق ہے جو تاریخ پر حاکم اصول وضوابط سے ایک ایسا مسئلہ وجود میں لاتا ہے جسے علوم کے دیگر شعبوں اور بشری معارف کے دیگر میدانوں کے برخلاف قرآنی فریضہ سے بے حد گہرا ربط اور زبردست لگاؤ ہے۔(یعنی ہدایت ہی کی طرح وہ بھی قرآن کی اہم ترین ذمہ داری ہے)اور وہ یہ ہے کہ قرآن کتاب ہدایت ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاح بشری اور تغیر باطن کی کتاب بھی ہے،اور ''تغیر باطن'' یہ قرآن کی وہی ذمہ داری ہے جس کو خود اس نے ''ظلمت سے نکال کر نور میں لانے'' سے تعبیر کیا ہے ''یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ'' ''تغیر باطن'' کا عمل دوہرے پہلوؤں کا حامل ہے۔اس کا اولین پہلو اس کے مضمون اور مطالب ومفاہیم کا ہے،جن کی بازگشت احکام الٰہی ،ضوابط حیات اور قوانین زندگی کی جانب ہوتی ہے اور جنہیں ہم تشریعی امور کا نام دیتے ہیں۔عمل تغییر کا یہ الٰہی ،ربانی اور آسمانی پہلو ہے،یہی پہلو اس شریعت الٰہیہ کی نمائندگی کرتا ہے جو نبی اکرمؐ پر نازل ہوئی اور جس کا نزول ہوتے ہی تمام تاریخیوں میں اس کا چرچا ہوا،کیونکہ یہ شریعت اس ماحول کی وسعت سے جس میں نازل ہوئی تھی کہیں زیادہ بڑی اور اس فرد کے دائرۂ وجود سے جس کو اس کی تبلیغ و رسالت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی،کہیں زیادہ وسیع تھی۔چنانچہ عمل تغییر کے اس پہلو کو مضمون اور مطالب ومفاہیم کے پہلو کا نام دیا جاسکتا ہے،نیز اسے تشریعی احکام اور ایسے قواعد وقوانین کے نام سے بھی یاد کرسکتے ہیں،عمل تغییر جن کی پابندی ہم پر لازم قرار دیتا ہے اور یہی اس کا الٰہی وربانی پہلو بھی ہے۔اس کے علاوہ عمل تغییر ایک اور پہلو کا حامل ہے جو نبی اکرمؐ اور اصحاب کرام کے ذریعہ بروئے کار آیا ہے،چنانچہ ہم جب اسے ایک ایسے عمل کی شکل میں جو لوگوں کے ایک گروہ یعنی پیغمبر اکرمؐ اور اصحاب کرام کی ذوات مقدسہ میں مجسمہ ہوکر سانے آیا ہے۔ ملاحظہ کرتے ہیں۔اور اسے ان افراد میں مجسم ایک اجتماعی عمل کے روپ میں دیکھتے ہیں۔نیز یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مختلف حالات و واقعات کے موڑ سے گذرا ہے اور جس نے متعدد اعتقادی، معاشرتی، سیاسی اور فوجی میدانوں میں اجتماعی بحث ونزاع کے مختلف مراحل سر کئے ہیں،(اسی صورت)جب ہم تغییر کے اس عمل کا اس حیثیت سے جائزہ لیتے ہیں کہ یہ عرصۂ تاریخ میں واقع ایک ایسا مجسم بشری کردار ہے جس کا(تاریخی دنیا کے علاوہ) دوسرے گروہوں اور دیگر حالات و واقعات سے بھی ایک ایسا تعلق، ربط اور لگاؤ ہے جو اس کی تائید وتردید دونوں کا مستحق بن سکتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب عمل تغیر نقطۂ نظر سے ہم مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ انسانی جنبہ کے حامل ایک بشری کردار کی شکل میں سامنے آتا ہے اور یہ وہ افراد ہیں جن پر دوسرے لوگوں کی مانند تاریخی اصول وضوابط بہت زیادہ حد تک حکم فرما ہوتے ہیں بالکل اسی صورت سے کہ جیسے دیگر طبقات اور گروہوں پر ان کی فرماں روائی ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ عملی تغییر اس کدکاوش کا نام ہے جو قرآن کریم اور پیغمبرؐ اکرم کی جانفشانیوں کا ثمرہ ،جس کے دو پہلو ہیں۔ایک قانون و شریعت اور دوسرا وحی والہام، چنانچہ وہ ایک الٰہی وربانی عمل

اور بشری تاریخ کی سطح سے کہیں زیادہ بلند اور مافوق ہے لیکن اس اعتبار سے کہ وہ ایک ایسا عمل ہے جسے تاریخ انسانیت کے میدان میں انجام دیا جارہا ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ ایک ایسی بشری سعی و کوشش کا نام ہے جس کا براہ راست دوسری بشری کاوشوں اور کوششوں سے مقابلہ اور ٹکر ہے۔

بہرحال اسے ایک ایسا تاریخی عمل تسلیم کرنا ہوگا جس پر تاریخی اصول وضوابط بہرصورت حاکم ہوں گے، چنانچہ خداوند عالم نے موجودات عالم کے نظم وضبط کی خاطر تاریخ کی دنیا میں جو قواعد وقوانین وضع فرمائے ہیں وہ اس پر حکم فرما ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ جب قرآن عمل تغییر کے اسی دوسرے پہلو یعنی بشری وانسانی جنبہ کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو اس کا محور محض ذات بشر ہوتی ہے آسمانی پیغام اور وحی والہام کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ انسان کے صرف بشری جنبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے گفتگو کرتا ہے اور ان انسانوں کا تذکرہ کرتا ہے جہاں وہ تمام تاریخی اصول وضوابط حکم فرما ہوتے ہیں جو دوسرے افراد کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں مثال کے طور پر ہمیں یہ ملے گا کہ جب قرآن نے جنگ احد میں مسلمانوں کی فتح وکامیابی کے مسئلہ پر روشنی ڈالنا چاہی،

درصورتیکہ وہ جنگ بدر میں عظیم الشان نمایاں کامیابی حاصل کرچکے تھے لیکن اس کے بعد انہیں جنگ احد میں کافی نقصانات اٹھانے پڑے اور ابتدا میں شکست کا سامنا کرنا پڑا، تو جب قرآن نے اس نقصان اور شکست کا تذکرہ کیا تو کن الفاظ میں کیا؟۔ کیا یہ کہا کہ سماوی پیغام اور نبوت ورسالت کو نقصان اور شکست کا سامنا کرنا پڑا؟ نہیں یہ ہرگز نہیں کہا!۔۔۔ کیونکہ وحی الٰہی اور نبوت ورسالت کا مرتبہ دنیاوی معیاروں کے مطابق وضع کئے گئے فتح وشکست کے مفاہیم سے کہیں زیادہ برتر اور بلند ہے۔ الٰہی پیغام اور نبوت ورسالت کبھی شکست خوردہ ہوئے ہیں اور نہ کبھی شکست کھاسکتے ہیں، ہاں جسے شکست کا منھ دیکھنا پڑتا ہے وہ صرف انسان ہے خواہ یہ وہی انسان کیوں نہ ہو جس کو الٰہی پیغام کی تبلیغ ورسالت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان بہرحال تاریخی اصول وضوابط کی گرفت میں ہوتا ہے، چنانچہ ہمیں اس سلسلے میں قرآن کا ارشاد یوں ملے گا ''وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ '' (آل عمران ۱۴۰) یعنی یہ (فتح وشکست کے) وہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کو یکے بعد دیگرے دکھاتے رہتے ہیں۔ یہاں پر قرآن نے انسانوں کا ذکر بحیثیت انسان کے کیا ہے، چنانچہ مقصود قرآنی یہ ہے کہ اس واقعہ کا ربط دراصل تاریخی اصول وضوابط سے ہے مسلمانوں کو جنگ بدر میں ایسی صورت حال میں کامیابی نصیب ہوئی جب تاریخی اصول وضوابط کے مطابق اس وقت کے موجودہ حالات فتح وکامیابی کے متقاضی تھے اور معرکۂ احد میں انہیں شکست کا منھ دیکھنا پڑا جب تاریخ کی رو سے اس وقت کی صورت حال شکست و ہزیمت کی متقاضی تھی ''اِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ الخ۔۔۔'' (آل عمران ۱۴۰) یعنی اگر تمہیں شکست اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑا ہے تو تمہارے دشمنوں پر بھی یہ افتاد پڑے گی، ہم نے فتح وشکست کے دنوں کو باری باری

سب کے لئے قرار دیا ہے۔قرآن کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم یہ تصور ہرگز نہ کرنا کہ فتح وکامیابی اللہ کا عطا کردہ تمہارا ذاتی حق ہے بلکہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ نصرت وکامیابی تمہارا فطری حق ہے،بشرطیکہ تم نے ان تاریخی اصول وقوانین کی روشنی میں اس کے اسباب ومقدمات خود فراہم کئے ہوں، جوحصول کامیابی کے لئے خداوند عالم کی جانب سے معین کئے گئے ہیں، چنانچہ جنگ احد میں تمہاری ناکامی کا یہی سبب ہوا، چونکہ تمہارے حالات فتح کے متقاضی نہیں تھے اس لئے شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔غرض کہ یہاں پر قرآن کا روئے سخن بشر کی طرف بعنوان بشر ہے۔اس کی گفتگو کا محور بشری اعمال وافعال ہیں، یہاں پیغام سماوی اور منصب نبوت ورسالت سے کوئی بحث نہیں ہے اور صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں بلکہ قرآن اس مرحلہ میں اور بھی آگے گیا ہے اور اس نے پردۂ تاریخ پر نقل وحرکت کرنے والی نہایت پاکیزہ وپارسا مخلوق یعنی دنیائے بشریت کو دھمکی تک دی ہے، چنانچہ خطاب کر کے کہا ہے کہ اگر تم اپنا تاریخی کردار صحیح معنوں میں ادا نہ کروگے اور خود کو اس بات کا اہل نہ بناؤ گے کہ الٰہی پیغام کی تبلیغی ذمہ داری اور منصب رسالت کا بار سنبھال سکو تو اس کا قطعاً یہ مطلب نہ ہوگا کہ وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع اور پیغمبری کا کام بند کر دیا جائے اور تاریخی اصول وقوانین نافذ نہ کئے جائیں، ایسا ہرگز نہ ہوگا، تم اگر اپنا فریضہ ادا نہ کروگے تو تمہاری جگہ پر دوسروں کو لایا جائے گا تاریخ تمہیں اپنے منصب سے معزول کر کے تمہارے بدلے یہ ذمہ داری دوسری امتوں کے حوالے کر دے گی، جو تمہارے مقابلہ میں تم سے کہیں زیادہ بہتر اسباب وحالات فراہم کرنے کی اہل ہوں گی اور تم سے کہیں زیادہ بہتر انداز میں اپنے فرائض وکردار ادا کر سکیں گی، اور صرف یہی نہیں بلکہ ایسی صورت حال میں جب حالات اس امر کے متقاضی نہ ہوں گے کہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو تو پھر وہ امتیں تم پر اور تمام لوگوں پر گواہ قرار دی جائیں گی چنانچہ اس مطلب کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ''اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ۔۔۔الخ'' (توبہ ۳۹) یعنی اگر تم نے خود کو جہاد کے لئے آمادہ نہ کیا تو دردناک عذاب میں مبتلا ہوگے، اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لائے گا تم اسے کسی طرح کا نقصان نہیں پہونچا سکتے ہو وہ ہر امر پر قادر ہے۔دوسری جگہ یوں ارشاد ہے

''یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا مَنْ یَرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ۔۔۔الخ'' (مائدہ ۵۴) یعنی اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی بھی اپنے دین سے منحرف اور مرتد ہوا تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض ایسے لوگوں کو وجود میں لائے گا جنھیں وہ خود دوست رکھتا ہوگا اور وہ بھی اسے دوست رکھتے ہوں گے، جو مومنین سے انکسار وخاکساری کے ساتھ پیش آئیں گے کافروں سے شدت وسختی کا سلوک روا رکھیں گے راہ خدا میں جہاد کریں گے اور انہیں ملامت کرنے والوں کی ملامت کا کوئی خوف وہراس نہ ہوگا۔یہ خدا کا لطف وکرم ہے وہ جسے چاہے نوازتا ہے اور وہ صاحب وسعت اور علیم ودانا ہے۔

معلوم ہوا کہ ان جگہوں پر قرآن کا موضوع بحث عمل تغییر کا دوسرا رخ بشری پہلو ہے اور انسان سے اس کی گفتگو اس کی کمزوری وناتوانی، استقامت وپامردی، انحراف وگمراہی

اور حالات کی فراہمی و عدم فراہمی اور سازگاری و ناسازگاری کے بارے میں ہے۔

چنانچہ یہ بات یہیں سے ثابت ہوجاتی ہے کہ تاریخ اور تاریخی اصول وضوابط کے موضوع کا قرآن جیسی الٰہی کتاب سے جو اگرچہ رشد و ہدایت کی کتاب ہے اور لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور میں لانے کے لئے نازل ہوئی ہے، بے حد گہرا ربط اور اعضائے جسمانی کا سا شدید تعلق ہے، کیونکہ عمل تغییر کے عملی رخ یا یوں کہا جائے کہ اس کے بشری پہلو کا سر تسلیم ہمیشہ تاریخ کے قواعد و قوانین کے سامنے خم اور سدا تاریخ کے زیر اثر ہے، لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس سے مکمل استفادہ کریں اور قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہمیں ایسے نظریات و تصورات عطا کرے جن سے فلسفۂ تاریخ اور تاریخی اصول وضوابط کے موضوع پر اسلام و قرآن کے بنیادی افکار و نظریات ایک ڈھانچہ سامنے آسکے۔

اس بیان سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہوجاتی ہیکہ فلسفۂ تاریخ کی نوعیت فزکس، کیمسٹری اور علوم فلکیات و حیوانیات و نباتیات وغیرہ کی سی نہیں ہے، کیونکہ ان علوم اور ان کے اصول وضوابط کا تاریخ سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہے، لیکن اس کے برعکس تاریخ اور تاریخی اصول وضوابط کا براہ راست رابطہ عمل تغییر سے ہے، اسی لئے جب بھی عمل تغییر کا دوسرا رخ زیر بحث آئے تو ضروری ہے کہ فلسفۂ تاریخ اور تاریخی اصول وضوابط کی بھی توضیح و تشریح کی جائے اور اس سلسلے میں ہمیں قرآن سے پوری توقع رکھنا چاہئے کہ وہ ہمیں اس موضوع سے متعلق بنیادی قواعد و قوانین سے آگاہ کرے البتہ ہماری یہ توقعات قطعاً بے جا ہوں گی کہ قرآن علم تاریخ اور اس کے قواعد وضوابط کی ایک درسی کتاب کا کردار ادا کرے یعنی اس کے دامن میں تاریخ سے متعلق تمام تفصیلات و جزئیات موجود ہوں حتی کہ اس میں وہ تمام باتیں بھی بیان کی گئی ہوں جن کا تغییر کے اس عمل سے جسے نبی اکرمؐ کی ذات گرامی نے انجام دیا ہے۔دور کا بھی واسطہ نہ ہو، کیونکہ قرآن بنیادی طور پر رشد و ہدایت کی کتاب ہے، اس نے کسی بھی مقام پر اپنے اس وصف و امتیاز کو کھویا نہیں ہے، وہ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لانے والی کتاب ہے چنانچہ ہر منزل میں وہ اپنی اس حقیقی شان اور ذاتی خصوصیت کا محافظ رہا ہے۔اس نے تاریخ و فلسفۂ تاریخ کے موضوع پر جو کچھ بھی بحث کی ہے انہیں حدود میں باقی رہتے ہوئے کی ہے اور تاریخ کے قواعد و قوانین کے متعلق منھ شگافیاں بھی بس اسی حد تک کی ہیں جس حد تک عمل تغییر کے پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے اور وہ بھی بس اسی دائرہ میں رہتے ہوئے جس دائرہ میں رہ کر نبی اکرمؐ نے اس کو انجام دیا ہے اور جس حد تک تاریخ و قوانین تاریخ کی جانب بشر کی رہنمائی ہوتی ہے اور وہ رونما ہونے والے واقعات و حادثات اور سامنے آنے والے حالات و کیفیات نیز زندگی کی صورت حال کے بارے میں صحیح رائے اور سچا نظریہ قائم کر سکنے کے قابل ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کے ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ تاریخ کے بھی کچھ اصول وضوابط

ہیں، جس طرح دیگر دنیاوی علوم وفنون کچھ قواعد وقوانین کے حامل ہوتے ہیں اسی صورت تاریخ کی دنیا میں بھی اس کے کچھ قواعد وضوابط معین ہیں، قرآن کریم میں یہ حقیقت نہایت واضح اور آشکار ہے، متعدد آیتوں میں مختلف عنوانات سے مختلف اسلوب اور انداز میں اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ انتہائی واضح طور پر اس بنیادی مفہوم کو جگہ جگہ بیان کیا گیا ہیکہ قرآنی نظریہ کے تحت بھی تاریخ کے کچھ اصول ہیں اور اس کے کچھ قواعد وقوانین معین ہیں۔

بعض دوسری آیتوں میں ان قوانین کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جو انسان کے سفر تاریخ پر حکم فرما ہیں نیز ان کی مثالیں، نمونے اور مصادیق بھی بیان کردیئے گئے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے مقام پر اس نظریہ یعنی فلسفۂ تاریخ کے بنیادی مفہوم کو اس کے مصادیق اور عملی نمونوں کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ بعض دیگر آیات میں تو گذشتہ حالات و واقعات سے سبق اور نصیحت حاصل کرنے کی بے حد تاکید کی گئی ہے اور تاریخ بشریت کی چھان بین اور اس کی گہری تحقیقات پر انسانی ہمت کو بھرپور ابھارا گیا ہے۔

جیسا کہ سبھی سمجھتے ہیں کہ پیش آنے والے واقعات وحادثات کی تحقیق ودریافت اور چھان بین کا کام بذات خود ایک علمی کام ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخی اصول وضوابط کا گہرا جائزہ لیا جائے اور اس کے قواعد و قوانین کا باقاعدہ تجزیہ کیا جائے ورنہ بغیر کسی قاعدے قانون کے تحقیق وتجزیہ اور چھان بین کا کوئی مفہوم نہیں۔

غرض کہ قرآن کریم نے مختلف آیتوں میں متعدد لب ولہجہ میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے اور تاریخ کے اصول وضوابط کے موضوع پر سیر حاصل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

☆☆☆

سلام

خطیب اعظم علامہ سید سبط حسن نقوی فاطر جائسی

دیں کو بے دینوں نے مطعونِ زمانہ کردیا
مصطفیؐ کی آل پر بند آب و دانہ کردیا

گردن و سر کی بلائیں ماں نے لیں وقتِ وداع
ان جھنڈولے بالوں میں اصغرؑ کے شانہ کردیا

مختصر سی بات تھی اک قطرہ پانی کا سوال
موت نے اصغرؑ کی اس کو اک فسانہ کردیا

خاندانِ مصطفیؐ کا مارنا مقصود تھا
ظالموں نے ترکِ بیعت کا بہانہ کردیا

اک زمیں ہوتی زمینِ نینوا بھی دہر میں
شاہ نے اس کو جناں کا آستانہ کر دیا

پردہ داروں کو میانِ خاک و خوں رہنے دیا
عورتوں کو شام کی جانب روانہ کر دیا

ہر قدم پر جس کو غش آتا تھا راہِ شام میں
اے فلک اس کو سپردِ تازیانہ کر دیا

دھوپ میں سیدانیاں کیا دیکھتیں لاشِ حسینؑ
کھول کر بالوں کو پیدا شامیانہ کر دیا

اصل میں مقصود تھی بے پردگیٔ آلِ پاک
چادروں کے چھیننے کا اک بہانہ کر دیا

کیوں نہ کھنچ آئے زبانِ تیرِ ظالم راہ میں
حُرملہ نے حلقِ اصغرؑ کو نشانہ کردیا

اے فلک کب تک رہیں زنداں میں آلِ مصطفیؐ
قید ہی میں ختم چہلم کا زمانہ کر دیا

جانتا تھا راہِ جنت اس لئے شبیرؑ نے
اپنے آگے قافلہ اپنا روانہ کر دیا

حضرتِ عباسؑ نے دیکھی جو تیروں کی بلا
صدقۂ مشکِ سکینہؑ اپنا شانہ کر دیا

(۲)

ہوا زمیں پہ کہ بالائے آسماں نہ ہوا
علیؑ کے لال کا ماتم کہاں کہاں نہ ہوا

سبھی فرات سے آ آکے پی گئے پانی
مگر حسینؑ سا کوئی بھی میہماں نہ ہوا

تمام ہو گئے لے لے کے کروٹیں اکبرؑ
یہ رنج ہے کہ کوئی دردِ دل بیاں نہ ہوا

وہ داغِ مرگِ پسر تھا کہ شاہِ صابر نے
چھپایا پردۂ دل میں مگر نہاں نہ ہوا

جو واقعات ہمارے امامؑ پر گذرے
کسی نبی کا بھی یوں سخت امتحاں نہ ہوا

نکل کے آگئے تیروں کی چھاؤں میں اصغرؑ
ہزار حیف کہ یہ بے زباں جواں نہ ہوا

قریب وقت شہادت تھا دن بھی آخر تھا
پدر سے ماتمِ فرزندِ نوجواں نہ ہوا

پڑی رہی یوں ہی بے دفن میتِ شبیرؑ
سوائے رحمت ِ حق کوئی پاسباں نہ ہوا

برائے نام مسلمان جمع تھے لاکھوں
پر ان میں ایک بھی بچے پہ مہرباں نہ ہوا

عطش کے حال کو قاتل سے کہہ گئے شبیرؑ
یہ تشنگی تھی کہ خنجر تلک رواں نہ ہوا

وہ قصۂ غم حسرت جو شاہ پر گذرا
سبھی تو کہتے ہیں پر آج تک بیاں نہ ہوا

سلام

شاعر اہلبیتؑ حضرت نجم آفندیؒ

ربط بڑھتا جارہا ہے ماتمِ شبیرؑ سے
استفادہ کر رہا ہوں موت کی تاخیر سے

واسطہ کیا ہو مجھے دنیا کی دارو گیر سے
ہاتھ خالی ہی کہاں ہیں ماتمِ شبیرؑ سے

حرّیت کی منزلوں میں سید سجادؑ نے
اک نیا جادہ بنایاپائے در زنجیر سے

سلسلہ جاری ہے صدیوں سے غمِ شبیرؑ کا
کتنے دل زخمی ہوئے ہیں حُر ملا کے تیر سے

جب زباں پر یاعلیؑ آتاہے فرطِ شوق میں
اک سہارا چاہتاہوں نعرۂ تکبیر سے

پوچھتے ہو اب غمِ شبیرؑ کی تاثیر کو
اب یہ آگے بڑھ چکا ہے منزلِ تاثیر سے

اہلِ بیتِؑ مصطفٰیؐ ہیں ماخذِ علم و عمل
کر تو دو ان کو الگ اسلام کی تصویر سے

کون سمجھے صاحبِ نہج البلاغہ کا مقام
مل گئی تحریر جب قرآن کی تحریر سے

ہم نے باب العلم کی چوکھٹ کا بوسہ لے لیا
لوگ ادھر الجھے رہے قرآن کی تفسیر سے

یہ اک ادنیٰ سی کرامت ہے غمِ شبیرؑ کی
آدمی انسان بنتا ہے غمِ شبیرؑ سے

ان سے کہدو جو خلافِ ماتمِ شبیرؑ ہیں
گردنیں اپنی بچاؤ دستِ خیبر گیر سے

تم نے قرآں در بغل جگ میں اندھیرا کر دیا
روشنی کی ہم نے اہلِ بیتؑ کی تفسیر سے

اپنے خوں سے نقشِ اِلاَّ اللہ کیوں لکھتے حسینؑ
کام چلتا گر دوات و خامہ کی تحریر سے

کربلا کی راہ میں حائل تھیں کتنی مشکلیں
نجم پہونچا لڑتا بھڑتا گردشِ تقدیر سے

کربلا کی راہ میں حائل تھیں کتنی مشکلیں
نجم پہنچا لڑتا بھڑتا گردشِ تقدیر سے

مرثیہ شام غریباں

شاعر اُمّی سید صادق علی ''چھنگا صاحب'' مرحوم حسینؔ جائسی

آج مقتل میں عجب بے سر و ساماں ہیں حرم   دل ہیں مجروح کھلے سر ہیں پریشاں ہیں حرم
قتلِ شبیرؑ سے بیتاب ہیں گریاں ہیں حرم   وارثوں میں نہیں اب کوئی تو حیراں ہیں حرم
ذکر مظلومیٔ شاہِ مدنی کرتے ہیں
کبھی آہیں تو کبھی سینہ زنی کرتے ہیں

خیمے سب جل چکے ہیں لوٹ چکے ہیں اعدا   فرق پر ہے کسی بی بی کے نہ مقنع نہ ردا
شام ہونے کو ہے سنسان ہے جنگل سارا   پاس بچوں کو لئے بیٹھی ہیں بنت زہراؑ
پیار کرتی ہیں اِسے گہہ اسے سمجھا تی ہیں
کوئی معصوم جو روتاہے تو بہلاتی ہیں

روکے فرماتی ہیں یہ خواہرِ سلطانِ انام   اٹھو سجاد کہ اب دن ہوا جاتا ہے تمام
جھٹ پٹا وقت ہے کچھ دیر میں ہونے کو ہے شام   اب نہ قاسمؑ ہیں نہ عباسؑ نہ اکبرؑ نہ امامؑ
دلِ پُر درد پہ اک غم کی گھٹا چھائی ہے
رات ہونے کو ہے اور عالمِ تنہائی ہے

کان میں پہونچی جو سجادؑ کے زینبؑ کی صدا   کھول کر آنکھ یہ کی عرض بصد آہ و بکا
کیا کہوں آپ سے قابو میں نہیں دل بخدا   تپ زیادہ ہے تو غفلت بھی ہے کچھ آج سوا
کون مارا گیا اور کون جدا ہوتاہے
مجھ کو کچھ ہوش نہیں ہے کہ یہ کیا ہوتاہے

بولے فضّہ سے یہ پھر عابدِ بیمار و حزیں　جتنے بچے ہیں بلالو تو انہیں میرے قریں
جمع فضہ نے کیا بچوں کو لالا کے وہیں　پر نہ دو لڑکے تھے اور ایک سکینہؑ غمگیں
ڈھونڈنے چار طرف مثل نظر جاتی تھی
ان کے رونے کی صدا بھی نہ مگر آتی تھی

کہا عابد نے کہ اے خواہرِ سلطانِ ہدا　لایئے شہ نے بنائی ہے جو فردِ شہدا
دیکھ لوں وہ تو مرے دل کو تسلی ہو ذرا　نام تحریر ہے اس فرد میں کس کا کس کا
جو گئے خلد میں اب خواب ہے صورت ان کی
جو مرے ساتھ ہیں لازم ہے حفاظت ان کی

سن کے یہ کہنے لگیں زینبؑ تفتیدہ جگر　لے گئے لوٹ کے اسباب تو سب بانئ شر
اسی اسباب میں وہ فرد بھی تھی اے دلبر　سن کے کہنے لگے سجادؑ یہ بادیدۂ تر
فکر کچھ اور میں پابندِ الم کرلوں گا
قتل جو ہوگئے نام ان کے رقم کرلوں گا

کہہ کے یہ لکھنے لگے خاک پہ نامِ شہدا　یاد آئے جو وہ سب کرنے لگے آہ و بکا
دل پہ اک تیر لگا نام جو اصغرؑ کا لکھا　غمِ جانکاہ سے تھرا گئے سارے اعضا
یاد کرتے تھے انہیں جب تو جگر جلتا تھا
تین بچوں کا کہیں پر نہ پتہ چلتا تھا

رو کے کرنے لگیں سجادؑ سے زینبؑ یہ کلام　جائے تشویش ہے دن کوئی گھڑی میں ہے تمام
ڈھونڈھنے بچوں کو جاتی ہوں کہ ہو جائے نہ شام　دو اجازت مجھے بیٹا کہ تمہیں اب ہو امامؑ
راستہ بھول گئے ہیں نہ ادھر آئیں گے
دشت میں جاکے پکاروں گی تو مل جائیں گے

لے کے رخصت چلیں عابد سے وہ بنتِ زہراؑ آ ذرا ساتھ مرے مڑ کے یہ فضہ سے کہا
وہ بھی ہمراہ ہوئیں کرتی ہوئی آہ و بکا پاؤں رکھتی تھیں کہیں اور کہیں پڑتا تھا
جا بجا دشت میں لاشے جو نظر آتے تھے
دل دھڑکتا تھا قدم خوف سے تھرّاتے تھے

آہ تھی لب پہ رواں اشک تھے اور دل تھا فگار اک طرف کو یہ چلی جاتی تھیں با حالتِ زار
ناگہاں دور سے دکھلائی دیا ایک سوار بولیں فضہ سے یہ زینبؑ کہ ذرا بڑھ کے پکار
منتیں اس کی کریں گے تو ترس کھائے گا
اس سے بچوں کا پتہ دشت میں مل جائے گا

حکم پانا تھا کہ فضہ نے یہ دی بڑھ کے صدا اے سوار اس طرف آ اس طرف آ بہرِ خدا
کوئی تکلیف نہ دیں گے تجھے ہم اس کے سوا ہم غریبوں کی ہے اک عرض اسے سنتا جا
دل ہے مجروح بہت روئی جو ہے بھائی کو
تجھ سے کچھ پوچھنا ہے فاطمہؑ کی جائی کو

متوجہ ہوا وہ سنتے ہی فضہ کی صدا پاس آ کر کہا کیا پوچھتی ہے اے دکھیا
بولیں یہ خواہرِ شبیرؑ کہ اے مردِ خدا کسی بچے کو تو دیکھا نہیں تونے یہ بتا
تشنہ لب ہیں، وطن آوارہ ہیں، دکھ پائے ہیں
چھوٹ کر ساتھ سے جنگل میں چلے آئے ہیں

عرض کی اس نے جگر تھام کے بادیدۂ تر ابھی صحرا میں جو اک سمت پڑی میری نظر
دیکھا اک لاشۂ پُر خوں ہے زمیں پر بے سر لڑکی اک چھوٹی سی بیٹھی ہوئی روتی ہے مگر
وہ بھی روتا ہے ادھر جس کا گذر ہوتا ہے
اس کے نالوں سے عجب دل پہ اثر ہوتا ہے

روکے فرمانے لگیں زینبؑ مجروح جگر مہربانی کا صلہ دے تجھے ربِّ اکبر
بس پتہ مل گیا احساں ہوا تیرا مجھ پر کہہ کے اس سمت چلیں گریہ کناں خاک بسر
اشک خوں بہتے تھے قابو میں دلِ زار نہ تھا
ایک فضہ کے سوا دوسرا غمخوار نہ تھا

پہونچیں القصہ وہاں پایا تھا جس جا کا پتا دیکھا اس جا پہ ہے اک نور سے معمور گڑھا
لاش اک اس میں پڑی ہے کہ نہیں سر جس کا اور سکینہؑ وہیں بیٹھی ہوئی کرتی ہے بکا
غش جو ہوتی ہے مزہ موت کا مل جاتا ہے
چونک پڑتی ہے تو دل سینے میں ہل جاتا ہے

آئیں نزدیک غرض زینبؑ تفتیدہ جگر بیٹھ کر لے لیا آغوش میں بادیدۂ تر
بولیں لپٹا کے کلیجے سے میں قرباں تجھ پر تو نے پہچان لیا باپ کا لاشہ کیوں کر
ہجر سے مادر ناشاد موئی جاتی ہے
بی بی اب گھر میں چلو رات ہوئی جاتی ہے

عرض کی اس نے پھوپھی سے یہ بصد آہ و بکا فرقتِ شہ میں تڑپنے جو لگا دل میرا
آ کے اس دشت میں چلائی میں بابا، بابا اے پھوپھی مجھ کو اسی لاش سے آئی یہ صدا
آئی ہوں سینۂ شبیرؑ پہ سونے کے لئے
کہا زینبؑ نے کہ اب گھر چلو رونے کے لئے

یہ تو بہلاتی تھیں رو رو کے وہ دیتی تھی جواب آتشِ غم سے وہ ننھا سا کلیجہ تھا کباب
گود میں مچلی ہوا دل جو زیادہ بیتاب پیار کر کے اسے زینبؑ نے بچشمِ پُر آب
لی بلائیں کبھی، گہہ آنکھوں سے آنسو پونچھے
خونِ سرور سے بھرے جو تھے، وہ گیسو پونچھے

دونوں بچوں کو چلیں ڈھونڈھنے پھر وہ مضطر　　ناگہاں جا پڑی اک سمت بیاباں میں نظر
دیکھتی کیا ہیں کہ وہ باغ نبی کے گل تر　　باہیں گردن میں ہیں اور سورہے ہیں رکھے سر
گرد اس طرح ہے ان چاند سے رخساروں پر
ابر باریک ہو جس طرح سے سیاروں پر

آئیں نزدیک جو روتی تو یہ نقشہ دیکھا　　مٹی سرکا کے وہاں لیٹے ہیں وہ ماہ لقا
ہونٹ سوکھے ہوئے تھے پیاس جو تھی حد سے سوا　　جس جگہ پا کے تری کچھ ہو کلیجہ ٹھنڈا
باپ کا سینہ نہیں ماں کی بھی آغوش نہیں
ایسے غافل ہیں کہ تن کا بھی انہیں ہوش نہیں

دیکھتے ہی انہیں بس بیٹھ گئیں زینبؑ زار　　لے کے دونوں کی بلائیں کیا پھر خوب سا پیار
سر رکھے خاک سے زانو پہ اٹھا کر اک بار　　بولیں اب گھر میں چلو نیند سے ہو کر ہشیار
سرد جنگل کی ہوا باعثِ آرام ہوئی
دشت غربت میں خبر بھی ہے تمہیں شام ہوئی

نیند سے جب ہوئے ہشیار نہ وہ رشکِ قمر　　جھک کے پھر غور سے چہروں پہ کی زینبؑ نے نظر
دم نہ پایا تو یہ فرمانے لگیں پیٹ کے سر　　شاید ان دونوں کا اب ہو گیا دنیا سے سفر
دشت ِ غربت میں کیا سب سے کنا را بچو
ہائے بے موت تمہیں پیاس نے مارا بچو

عرض کرنے لگیں زینبؑ سے یہ فضہ غمگیں　　بی بی ہے ہے مرے دل کو یہی ہوتا ہے یقیں
لوٹ کر خیموں کو جانے لگی جب فوجِ لعیں　　آ گئے گھوڑوں کی ٹاپوں میں یہ خورشید مبیں
حال ان کے جگر وقلب کو تڑپاتے ہیں
پھول سے جسموں پہ سب نیل نظر آتے ہیں

بس حسینؔ روک قلم اب نہیں تابِ تحریر　　دل میں نشتر کی طرح چبھتے ہیں اب رنج کے تیر
صاف ہر زخم صدا دیتے ہیں ہے ہے شبیرؑ　　کیسی برگشتہ ہوئی اہلِ حرم کی تقدیر
آسماں گر نہ پڑا پھٹ کے ستمگاروں پر
ظلم کیا کیا نہ کئے فاطمہؑ کے پیاروں پر

فہرست مضامین

ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

اداریہ

ماہنامہ ''شعاع عمل'' کا دوسرا شمارہ پیش کرتے ہوئے مؤسسۂ نور ہدایت کے متعلقین شکر حضرت الٰہی بجالاتے ہیں کہ یہ نوبت آئی اور یہ دعا کرتے ہیں (آپ برائے کرم صمیم قلب سے آمین کہیں) کہ یہ سلسلہ ظہور حضرت حجتؑ سے متصل ہوجائے ہماری یہ بھی دعا ہے کہ مؤسسہ کے بانی اور روح رواں معین الشریعہ جناب مولانا کلب جواد نقوی صاحب کی عمر وصحت میں خداوند کریم برکت دے کہ جو ہورہا ہے اور جو انشاء اللہ آئندہ ہوگا سب جناب کا ہی فیضان ہے۔

گذشتہ یعنی پہلے شمارہ کو سید العلماء علامہ سید علی نقی نقوی مجتہد طاب ثراہ، علامہ سید علی حائری مجتہد طاب ثراہ، عمدۃ العلماء ذاکر شام غریباں مولانا سید کلب حسین نقوی مجتہد طاب ثراہ، فیلسوف اسلام آیت اللہ شہید باقر الصدر طاب ثراہ، آقائے شریعت صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد نقوی طاب ثراہ، آیت اللہ سید باقر نقوی مدظلہ، عماد العلماء علامہ ڈاکٹر سید علی محمد نقوی مدظلہ، حکیم امت ڈاکٹر مولانا سید کلب صادق مدظلہ، قائد ملت جعفریہ مولانا سید کلب جواد نقوی مدظلہ، مفکر اسلام علامہ عقیل الغروی مدظلہ کے مضامین کے علاوہ خطیب اعظم علامہ سید سبط حسن نقوی فاطرؔ جائسی اعلی اللہ مقامہ، شاعر فطرت سید صادق علی نقوی (چھنگا صاحب) حسینؔ جائسی مرحوم اور شاعر آل محمد حضرت نجم آفندی رحمہ اللہ کے کلام سے تزئین و توقیر حاصل ہوئی ہے۔

جس دورانیہ کا یہ شمارہ ہے اس میں سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عید میلاد اور سانحۂ شہادت دونوں ہیں اس کے پیش نظر شمارے میں حضرت سے متعلق کئی چیزیں ہیں۔ حضرت سبط اکبرؑ کی شہادت ہر چند ۲۸؍صفر کی ہے مگر پچھلے شمارے میں زیادہ تر ذکر کربلا کا رہا حضرت پر کچھ پیش نہیں کیا جاسکا اس کی تلافی اب کی جارہی ہے۔ ۱۷؍ربیع الاول عید

دوگانہ ہے سرور کائناتؐ کی عید میلاد کے ہی دن ہمارے چھٹے امام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت باسعادت ہے۔اس مناسبت سے مصحف ناطق حضرت امام جعفر صادقؑ کے متعلق ایک تحریر حاضر ہے۔۸ ربیع الاول گیارہویں امام حضرت امام حسن عسکریؑ کی شہادت ہے۔ہندوستان میں فصل عزاء کا خاتمہ اسی تاریخ کو ہوتا ہے، حضرت کے تعلق سے بھی ایک مختصر مضمون پیش کیا جارہا ہے۔ہم ثقلین سے متمسک ہیں اس لئے قرآن مجید کے بارے میں آیت اللہ العظمیٰ رہبر انقلاب سید علی خامنہ ای مدظلہ کا ایک اثر خامہ شامل کیا جارہا ہے۔منظومات بھی اسی مناسبت سے ہیں۔

ایام عزاء کی مصروفیت اور منبر کی خدمت کی وجہ سے ابھی نہ بانیٔ مؤسسہ دام عزہ یا ہم خادمان مؤسسہ کو اس کا موقع نہیں ملا ہے کہ پہلے شمارے کو وہاں تک پہونچا یا جاسکے جہاں رواجاً یا اخلاقاً پہونچانا ضروری ہے۔اب خدمت عزاء کا بار ہلکا ہو جانے سے اس کی تلافی کی جائے گی۔آخر میں پھر مصروف امور خیر حضرات اور علم دوست اشخاص سے مودبانہ درخواست ہے کہ خود بھی ماہنامہ کے ممبر بنیں اور دوسرے شائقین مطالعہ کو بھی ممبر بنائیں ساتھ ہی دیگر امداد کے ذرائع فراہم فرمائیں تاکہ نور ہدایت کے دوسرے شعبے کمزوری وکوتاہی کا شکار نہ ہوں۔

قوی امید ہے مخیر افراد پر خلوص التماس کو مسترد نہ فرما کر ادارہ کی دامے، درمے، سخنے، قدمے مدد کر کے عنداللہ والمعصومینؑ ماجور اور عندالناس مشکور ہوں گے۔

مؤسسہ نور ہدایت
حسینیہ حضرت غفران مآبؒ چوک لکھنؤ
(یو۔پی۔) ہند

قرآن شناسی

حاکمیت قرآن

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کِتَابٌ اَنْزَلْنَاہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّھِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ (ابراہیم/۱)

قرآن آپ پر ہم نے اس لئے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے روشنی میں نکال کر لے جائیں ان کے رب کے حکم سے غالب وقابل (صد ہزار) حمد ذات کے راستہ کی طرف۔

رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا ''اِذَا الْتَبَسَتْ عَلَیْکُمُ الْفِتَنُ کَقِطَعِ اللَّیْلِ الْمُظْلِمِ فَعَلَیْکُمْ بِالْقُرْآنِ فَاِنَّہٗ شَافِعٌ مُشَفَّعٌ مَاحِلٌ مُصَدَّقٌ مَنْ جَعَلَہٗ اَمَامَہٗ قَادَہٗ اِلَی الْجَنَّۃِ وَمَنْ جَعَلَہٗ خَلْفَہٗ سَاقَہٗ اِلَی النَّارِ۔۔۔۔۔اِلَخْ''

جب اندھیری رات کے تاریک حصوں کی طرح فتنے تمہارے لئے الجھنیں پیدا کردیں تو تمہیں قرآن ہی سے وابستہ رہنا چاہیئے۔اس لئے کہ قرآن شفاعت، سفارش، کرنے والا ہے، اس کی شفاعت قبول ہے قرآن تصدیق شدہ مدبر ہے جس نے اسے اپنے سامنے رکھا قرآن اسے جنتمیں لے جائیگا اور جس نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا وہ ایسے شخص کو جہنم پہونچا دیگا۔وہ بہترین راستے کا رہنما ہے۔وہ ایسی کتاب ہے جس میں تفصیل وتشریح اور نتیجہ خیزی ہے۔وہ حتمی وقطعی (کتاب فیصلہ کن) ہے۔غیر سنجیدہ چیز نہیں۔اسکا ظاہر ہے اسکا باطن ہے۔اسکا ظاہر حکم (وفیصلہ) ہے اور اسکا باطن علم ہے اسکا ظاہر دلکش وحسین، اسکا باطن گہرا، اسکی تہہ ہے پھر تہوں پر تہیں ہیں۔اسکے عجائب کا شمار اور اسکے غرائب (ندرتوں) پر کہنگی نہیں۔قرآن میں ہدایتوں کے چراغ اور حکمتوں کے مینار ہیں۔جو صفات کو سمجھ لے اسکی معرفت پر قرآن رہنما ہے۔

نظر دوڑانے والے کو اسے دیکھنا چاہیئے اور نگاہ کو اسکے صفات تک رسائی حاصل کرنا ضروری ہے قرآن مبتلاء ہلاکت کو نجات اور مشکلوں میں پھنسے ہوئے کو خلاصی دلاتا ہے۔

اور حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

وَاعْلَمُوْا اَنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ ھُوَ النَّاصِحُ الَّذِیْ لَا یَغُشُّ وَالْھَادِیْ الَّذِیْ لَا یُضِلُّ۔۔۔۔۔۔اِلَخْ

یاد رکھو! یہ قرآن (مجید) وہ مخلص ہے جو کبھی گمراہ نہیں کرتا، وہ سخن گو ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔جو بھی قرآن کے ساتھ بیٹھتا ہے تو یا کچھ زیادہ لیکر یا کمی لیکر اٹھتا ہے۔ہدایت میں اضافہ اور نابینائی (جہالت) میں کمی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کی جو

تعریف کی ہے (اور اسکا جس طرح تعارف فرمایا ہے) آج امت اسلامیہ کے لئے خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ جس قسم کی تہہ در تہہ تاریکیوں اور کالے بادلوں سے مسلمانوں کی زندگی کا ماحول آج تاریک ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ اسکا پہلا مرحلہ وہ تھا جب اسلامی خلافت، طاغوتی سلطنت سے بدلی۔ قرآن حکیم درحقیقت ایک اوپری قسم کے تکلف میں (اور رسم میں) شمار ہونے لگا۔ اسماً نہیں۔ وہ مسلمانوں کی زندگی کی سطح سے باہر ہو گیا۔ لیکن بیسویں صدی کے عہد جاہلیت میں سیاسی پیچ وخم اور پروپیگنڈے کے ایسے مرحلے میں داخل کر دیا گیا ہے کہ جو کہیں زیادہ خطرناک اور کہیں زیادہ فکرمند کرنے والی بات ہے۔

سب سے بڑا ذریعہ اور مؤثر ترین حیلہ، جس سے اسلام کو ایک گوشہ میں کیا جاسکتا تھا، یہی تھا کہ مسلمان عوام کے دل ودماغ کی فضا سے قرآن کو نکال دیا جائے۔ اسلامی ممالک میں استعماری طاقتوں کے آتے ہی یہ کام نقطۂ مرکزی اور بیرونی اقتدار طلب لوگوں کا عمل بن گیا، طرح طرح کے طور طریقوں سے یہ راستہ اختیار کیا گیا۔

قرآن، جسے خود اسی کتاب مقدس میں نور، ہدایت، حق کو باطل سے جدا کرنے والا، زندگی، میزان، شفا، ذکر، جیسے نام دئے گئے ہیں۔ اسی وقت ان خصوصیات کا مظہر ہو سکے گا جب پہلے مرکز فکر وفہم اور دوسرے مرحلے میں محور عمل قرار پائے۔

صدر اول، اسلامی حکومت کے دور میں قرآن ہی حرف آخر اور فیصلہ کن حکم تھا۔ حد یہ ہے کہ خود کلام پیغمبر اکرمؐ کو اسی کی بنیاد پر پرکھتے تھے۔ معاشرہ میں علماء قرآن صحیح قدر ومنزلت کے حامل تھے۔ حضورؐ نے لوگوں کو سمجھایا تھا:

اَشْرَفُ اُمَّتِیْ اَصْحَابُ اللَّیْلِ وَ حَمَلَۃُ الْقُرْآنِ

میری امت کے معزز لوگ شب بیدار (نماز شب پڑھنے والے) اور حاملین قرآن ہیں۔

حمل قرآن، قرآن یاد کرنا، اسکا سمجھنا، اور اس پر عمل کرنا ہے۔ ان دنوں یہ صفت ایک معاشرتی ''قدر'' تھی زندگی کی ہر مشکل میں قرآن کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ہر بات کو ماننے نہ ماننے کو دعوے کو پرکھنے اور ہر رویّے کو قبول کرنے نہ کرنے کا معیار قرآن تھا۔ وہ لوگ حق وباطل کو قرآن کے ذریعہ پہچانتے، اسکے بعد زندگی کے میدان میں اسکے نمونے دیکھتے اور معین کرتے تھے۔ جب سے اسلامی معاشروں پر مسلط ہونے والی قوتیں اسلامی اقدار سے تہی دست اور اجنبی ہونے لگیں اسی وقت سے انہوں نے قرآن کو جو حق وباطل میں فرقان ہے اپنے لئے رکاوٹ سمجھنا شروع کیا پھر اس مہم کا آغاز ہوا کہ خدا کا کلام زندگی کے میدان سے ہٹا دیا جائے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دین، معاشرتی زندگی سے جدا، دنیا آخرت سے الگ ہو گئی اور حقیقی دینداروں اور دنیا طلب طاقتوروں میں ٹھن گئی۔ زندگی کے میدانوں اور مسلمانوں کے معاشرے میں اسلام کو انتظامی منصب سے ہٹا دیا گیا۔ اسکا تعلق عبادت گاہوں، مسجدوں اور گوشہائے دل سے سمجھ لیا گیا۔ یوں ایک طویل نقصان رساں فراق زندگی و دین رونما ہوا۔ مغربی تسلط صلیبی وصیہونی ہمہ جہت حملوں سے پہلے اگرچہ حقیقی

معنوں میں قرآن زندگی کے میدان میں غالب نہ تھا، مگر یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کے دل ودماغ پر کم وبیش (اسکا ایک اثر تھا) صلیبی وصیہونی حملہ آور اسے بھی برداشت نہ کر سکے جو قرآن آشکار احکم دیتا ہے'' ان کے لئے جتنی قوت اور جتنے رہواروں کی طاقت تم سے جمع ہو سکے جمع کرو (سامان جنگ مہیا کرو) الانفال/ ۶۰ جو قرآن فرماتا ہے'' اور اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں پر غلبہ نہیں دیگا'' النساء/ ۱۴۱

جو قرآن مومنوں کو ایک دوسرے کا بھائی، دشمنوں پر سخت گراں اور غضب ناک دیکھنا پسند کرتا ہے۔ وہ قرآن ایسے لوگوں کے لئے نا قابل برداشت تھا جو مسلمانوں کے معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیکر ان پر مسلط ہو کر انکا سب کچھ تباہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ اقتدار حاصل کرنے والے اچھی طرح سمجھ چکے تھے کے عوام کی قرآن سے اپنی زندگی میں تھوڑی سی بھی وابستگی ان کے اقتدار اور نفوذ کی راہ کو ناہموار بنا دیگی۔ لہٰذا انہوں نے قرآن کو یکسر ہٹا دینے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن یہ منصوبہ ہرگز عملی جامہ نہ پہن سکے گا، خدا نے امت اسلامیہ سے قرآن کی دائمی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اسکے با وجود دشمنوں کے اس مدعا کو انجام تک پہونچانے کے ارادے اور اسکے نتائج واثرات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

آج مسلمانوں کی زندگی پر ایک نظر ڈالئے، قرآن کہاں ہے؟ سرکاری اداروں میں ہے؟ اقتصادی نظام میں ہے؟ روابط کے نظم ونسق اور عوام کے باہمی تعلقات میں ہے؟ اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں ہے؟ خارجہ سیاست یا حکومتوں سے تعلقات میں قرآن ہے؟ عوام میں قومی سرمایہ کی تقسیم میں ہے؟ اسلامی معاشرے کے سربراہوں کے اعداد وخصائل میں، اقوام وملل کے مختلف طبقات میں جن کے کم وبیش اثرات ہیں، کہیں قرآن نظر آتا ہے؟ اسلامی احکام کی انفرادی رفتار میں، زن ومرد کے روابط میں، خوراک ولباس میں؟ زندگی کے کس اصلی پرتو میں قرآن ہے؟ ایوانوں میں؟ امانتوں اور بینک ڈپاذٹ میں؟ معاشرت میں؟ آخر انسانوں کے عوامی اور سماجی تحریکات میں کہاں قرآن ہے؟ زندگی کے اتنے میدان ہیں۔ مسجدوں اور میناروں، عوام فریبی اور ریا کاری کے لئے ریڈیو کے چند پروگرام البتہ مستثنیٰ ہیں۔ مگر کیا قرآن فقط اسی لئے ہے؟ سید جمال الدین سو برس پہلے اس بات پر روئے تھے کہ قرآن ہدیہ دینے اور آرائش و زینت، قبرستان میں تلاوت کرنے، طاقوں میں رکھنے کے لئے رہ گیا ہے۔ بتایئے سو سال میں کوئی فرق پڑا ہے؟ کیا امت قرآن کی حالت پریشان کن نہیں ہے؟ بات یہ ہے کہ قرآن انسانی زندگی کی کتاب ہے اور انسان کی حد نہیں ہے۔ انسان ترقی پذیر ہے۔ انسان کی بہت سی جہتیں ہیں۔ وہ انسان جسکی ترقی پذیری کی حد اور سرحد نہیں۔ ہر زمان وہ راہنما ومعلم ودستگیر ہے انسان کو مہذب اور موزوں زندگی فقط قرآن ہی کے ذریعہ سکھائی جاسکتی ہے۔ ظلم، نسلی امتیاز، فتنہ وفساد، جھگڑے، سرکشی، ناروائی، رسوائی، خیانت جو انسانی تاریخ کے طویل دور میں ہوئی اور انسان کے نشونما اور ترقی میں رکاوٹ رہی ہے اسے قرآن ہی کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے انسانی زندگی کا منشور

قرآنی ہدایات بناتیں ہیں، فقط وہی عمل ہے اور بس۔ قرآن کی طرف رجوع انسان کی شائستہ زندگی کی طرف رجوع ہے اس عمل کی ذمہ داری قرآن پر ایمان رکھنے والوں پر عموماً اور قرآن شناس حضرات پر ان سے زیادہ ہے۔ یہ علماء اور خطباء کی ذمہ داری ہے۔ قرآن کی طرف رجوع ایک نعرہ ہے یہ نعرہ اگر حقیقت بن جائے تو یہ حقیقت حق وباطل میں فرق کردے۔ جو قوتیں قرآن کی طرف بازگشت کو برداشت نہیں کرسکتیں، مسلمانوں کو چاہیئے کہ ایسی قوموں کو برداشت نہ کریں۔

برادارانِ وخواہرانِ اسلام!

ہم بھی قرآن سے دور افتادہ بین الاقوامی قرآن دشمن منصوبہ کی آسیب زدہ تھے، قرآن کی طرف بازگشت کا لطف نہیں دیکھا تھا۔ ایران کا پرشکوہ اسلامی انقلاب، اور نظام جمہوری اسلامی کا قیام اس بازگشت کی ایک برکت کا اثر ہے۔ آج یہ قوم، زندگی کی فضا، معاشرتی تعلقات حکومت کی تشکیل وہیئت، اپنے رہنماؤں کے اخلاق و عادات سیاست خارجہ، نظام تعلیم وتربیت میں قرآنی تعلیمات کے کچھ شرارے دیکھ رہی ہے۔ اب تک بہشت قرآن کی ایک نسیم کا جھونکا ہم تک آیا ہے لیکن اس حقیقی جنت کے اندر جانے کا راستہ کھلا ہے۔

ہمیں فخر ہے، ہم نے گوش ہوش صدائے قرآن کے حوالہ کردئے ہیں۔ تمام اقوام کی ذمہ داری بھی یہی ہے خصوصاً علماء دین، دانشور، خطیب، لکھنے والے اور محقق حضرات پر یہ سب سے بڑا فریضہ ہے۔

''اسلامی فکر'' کانفرنس نے اگر قرآنی معارف پیش کئے اور معرفت قرآن کے موضوع کی طرف نئے قدم بڑھائے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ اسنے اپنا مشن پورا کرلیا۔ اس کانفرنس کے پروگرام میں جو موضوع زیر بحث آئیں وہ ذہنوں کو مطمئن کریں کہ زندہ انسانی معاشرہ کی گردش وحرکت کے لئے ہر چیز قرآن میں موجود ہے۔ ذہنی معلومات سے عملی اندازوں اور رہنما حرکت آفرین، اور نظام بخش عقیدے سے لیکر اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے رنگا رنگ نظام تشکیل دینے والے معاملات تک۔ اور گذشتہ تاریخ بشر کی تحلیل وتجزیہ سے مستقبل کی پیشین گوئی تک۔ آج تمام فلسفے، تمام نظریات، مادی آئیڈیالوجی کے رنگا رنگ پہلو ذہنی وعملی بھول بھلیوں تک پہونچ چکے ہیں، وہ انسانی قوتوں کو سمیٹنے اور ایک دوسرے کو جذب کرنے سے عاجز ہوچکے ہیں۔

اب قرآن کی حاکمیت کا دور ہے۔ وہی انسان کے ذہنی وعملی خلاء کو پر کریگا وہ ''لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ'' کی بشارت دے رہا ہے۔

بھائیوں اور بہنو!

اطلاعات سے عمل، تلاوت سے تفسیر، قبول ذہنی سے وجود خارجی تک اپنی کوششوں کا محور قرآن کو قرار دیجئے، اسی کا اتباع کیجئے۔ قرآن کی طرف رجوع وبازگشت کا نعرہ اپنے ملکوں اور اپنے عوام میں لے جایئے اور اس نصب العین کو عملی بنانے کے لئے عوام کو قریب لایئے اور ان کی ہمت بڑھایئے۔

اس مبارک کوشش میں مجھے امید ہے کہ روح قرآن آپکی مدد اور رہنمائی کریگی۔

معراج انسانیت

سیرت حضرت خاتم الانبیاء کی روشنی میں

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

آپؐ چالیس برس کی عمر میں مبعوث بہ رسالت ہوئے ۱۳ سال ہجرت کے قبل مکہ کی زندگی ہے اور دس سال بعد ہجرت مدینہ کی زندگی۔

یہ تینوں دور بالکل الگ الگ کیفیت رکھتے ہیں جن میں سے ہر دور بالکل یک رنگ ہے۔ کسی تلون اور غیر مستقل مزاجی کا مظہر نہیں ہے مگر وہ سب دور آپس میں بہت مختلف ہیں

پہلے چالیس برس کی مدت میں زبان بالکل خاموش اور صرف کردار کے جوہر نمایاں یہی آپ کی سچائی کا ایک نفسیاتی ثبوت ہے۔ کیونکہ جو غلط دعویدار ہوتے ہیں ان کے بیانات واظہارات کی رفتار کو دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ وہاں پہلے ان کے دل ودماغ میں تصور آتا ہے کہ ہمیں کوئی دعویٰ کرنا چاہئے مگر انہیں ہمت نہیں ہوتی اس لئے وہ کچھ مشتبہ الفاظ کہتے ہیں جن سے کبھی سننے والوں کو وحشت ہوتی ہے اور کبھی اطمینان پھر وہ رفتہ رفتہ قدم آگے بڑھاتے ہیں پہلے کوئی ایسا دعویٰ کرتے ہیں جس کو تاویلات کا لباس پہنا کر رائے عامہ کے مطابق بنایا جاسکے یا جسکی حقیقت کو صرف خاص خاص لوگ سمجھ سکیں۔ اور عام افراد محسوس نہ کریں۔ جب جھجک نکل جاتی ہے تو پھر جی کڑا کر کے کھل کر دعویٰ کر دیتے ہیں۔ اسکی قریبی مثالیں علی محمد باب اور غلام احمد قادیانی میں بہت آسانی سے تلاش کی جاسکتی ہیں۔

حضرت پیغمبر اسلامؐ کی زبان سے چالیس برس تک کوئی لفظ ایسی نہیں نکلی جس سے لوگ ادعائے رسالت کا توہم بھی کر سکتے یا کوئی بے چینی اس حلقہ میں پیدا ہوتی۔ غلط سے غلط روایت بھی ایسی نہیں جو بتائے کہ کفار نے کسی آپ کی لفظ سے ایسے دعویٰ کا احساس کیا ہو جس پر ان میں کوئی برہمی پیدا ہوئی ہو اور پھر آپ کو اس کے متعلق صفائی پیش کرنے کی ضرورت ہوئی ہو۔ بلکہ اس دور میں آپ کا کام صرف اپنی سیرت بلند کی عملی تصویر دکھانا تھی جس نے ایک مقناطیسی جذب کے ساتھ دلوں کو تسخیر کر لیا تھا اور آپ کی ہر دلعزیزی ہمہ گیر حیثیت رکھتی تھی اسکے بعد چالیس برس کی عمر میں جب دعوائے رسالت کیا تو وہ بالکل وہی تھا جو آخر تک آپ کا دعویٰ رہا۔ یہ نہیں ہوا کہ پہلے اس دعوے میں خفت ہو، پھر شدت پیدا ہو۔ یا پہلے دعویٰ کچھ

ہو اور پھر رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوئی ہو۔ اب اس دعوائے رسالت کے بعد آپؐ کو کتنے مصائب وتکالیف برداشت کرنا پڑے وہ سب کو معلوم ہیں۔ یہ پر آشوب دور تھا وہ کہ جب سر مبارک پر خس وخاشاک پھینکا جاتا تھا، جسم اقدس پر پتھروں کی بارش ہوتی تھی۔ تیرہ برس اس طرح گذرتے ہیں مگر ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوتا کہ ان کا ہاتھ تلوار کی طرف چلا جائے اور ارادہ جہاد کا کیا جائے۔

اگر کوئی رسولؐ کی زندگی کے صرف اس دور ہی کو دیکھتے تو یقین کرے گا کہ جیسے آپ مطلق عدم تشدد کے حامی ہیں یہ مسلک اتنا مستقل ہے کہ کوئی ایذا رسائی، کوئی دل آزاری اور کوئی طعن وتشنیع آپ کو اس راستے سے نہیں ہٹا سکتی پہلے چالیس برس ہی کی طرح اب یہ رنگ اتنا گہرا اور یہ مسلک اتنا راسخ ہے کہ اس کے درمیان کوئی ایک واقعہ بھی اس کے خلاف نمودار نہیں ہوتا۔ کوئی بے بس اور بے کس بھی ہو تو کسی وقت تو اسے جوش آ ہی جاتا ہے اور وہ جان دینے اور جان لینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے پھر چاہے اسے اور زیادہ ہی مصائب کیوں نہ برداشت کرنا پڑیں۔ مگر ایک دو برس نہیں تیرہ سال مسلسل اس غیر متزلزل صبر وسکون کے ساتھ وہی گذار سکتا ہے جس کے سینہ میں وہ دل اور دل میں وہ جذبات ہی نہ ہوں جو جنگ پر آمادہ کر سکتے ہیں۔

اسی درمیان میں وقت آتا ہے کہ مشرکین آپ کے چراغ زندگی کے خاموش کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں اور ایک رات طے ہو جاتی ہے کہ اس رات سب ملکر آپ کو شہید کر ڈالیں اس وقت بھی رسولؐ تلوار نیام سے باہر نہیں لاتے کسی مقاومت کے لئے کھڑے نہیں ہوتے بلکہ بحکم خدا شہر چھوڑ دیتے ہیں جو معرفت محمدؐ نہ رکھتا ہو وہ اس ہٹنے کو کیا سمجھے گا؟ یہی تو کہ جان کے خوف سے شہر چھوڑ دیا۔ اور پھر حقیقت بھی یہ ہے کہ جان کے تحفظ کے لئے یہ انتظام تھا مگر فقط جان نہیں بلکہ جان کے ساتھ ان مقاصد کا تحفظ جو جان کے ساتھ وابستہ تھے بہر حال اس اقدام یعنی ترک وطن کو کوئی کسی لفظ سے تعبیر کرے مگر اسے دنیا مظہر شجاعت تو نہیں سمجھے گی اور صرف اس عمل کو دیکھ کر اگر اس ذات کے بارے میں کوئی رائے قائم کرے گا تو وہ حقیقت کے مطابق نہیں ہو سکتی بلکہ گمراہی کا ثبوت ہوگی۔

اب ترپن برس کی عمر ہے اور آگے بڑھاپے کے بڑھتے ہوئے قدم ہیں بچپنا اور جوانی کا اکثر حصہ خاموشی میں گذرا ہے پھر جوانی سے لیکر ادھیڑ عمر کی منزلیں پتھر کھاتے اور برداشت کرتے گذر رہی ہیں اور آخر میں اب جان کے تحفظ کے لئے شہر چھوڑ دیا ہے بھلا کسے تصور ہو سکتا ہے کہ جو ایک وقت میں عافیت پسندی سے کام لیتے ہوئے شہر چھوڑ دے وہ عنقریب فوجوں کی قیادت کرتا ہوا نظر آئیگا حالانکہ مکہ ہی نہیں بلکہ مدینہ میں آنے کے بعد بھی آپ نے جنگ کی کوئی تیاری نہیں کی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک سال کی مدت کے بعد جب دشمنوں کے مقابلہ کی نوبت آئی تو آپ کی جماعت میں

جو کل جمع ۳۱۳ آدمیوں پر مشتمل تھی صرف ۱۳ عدد تلواریں تھیں اور دو گھوڑے تھے ظاہر ہے کہ ایک سال کی تیاری کا نتیجہ یہ نہیں ہوسکتا تھا۔ جب کہ اس ایک سال میں تعمیری خدمات بہت سے انجام پاگئے۔ مدینہ میں کئی مسجدیں بن گئیں مہاجرین کے قیام کے لئے مکانات تیار ہوگئے۔ بہت سے دیوانی و فوجداری کے قوانین نافذ ہوگئے اور اس طرح جماعت کی مملکتی تنظیم ہوگئی مگر جنگ کا کوئی سامان فراہم نہیں ہوا اس سے بھی پتہ چل رہا ہے کہ آپ کی طرف سے جنگ کا کوئی سوال نہیں ہے مگر جب مشرکین کی طرف سے جارحانہ اقدام ہوگیا تو اس کے بعد بدر ہے، احد ہے، خندق ہے، خیبر ہے، اور حنین ہے، پھر یہ نہیں کہ اپنے گھر میں بیٹھ کر فوجیں بھیجی جائیں اور فتوحات کا سہرا اپنے سر باندھا جائے بلکہ رسول خداؐ کا کردار یہ ہے کہ چھوٹے اور غیر اہم معرکوں میں تو کسی کو سردار بنا کر بھیج دیا ہے۔ مگر ہر اہم اور خطرناک موقع پر فوج کے سردار خود ہوتے ہیں اور یہ نہیں کہ اصحاب کو سپر بنائے ہوئے ان کے حصار میں ہوں بلکہ اسلام کے سب سے بڑے سپاہی حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی گواہی ہے کہ جب جنگ کا ہنگامہ انتہائی شدت پر ہوتا تھا تو ہمیشہ رسول اللہؐ ہم سب سے زیادہ دشمن کے قریب ہوتے تھے پھر یہ بھی نہیں کہ یہ قیام فوج کے سہارے پر ہو بلکہ احد میں یہ موقع بھی آگیا کہ سوا دو ایک کے باقی سب مسلمانوں سے میدان جنگ خالی ہوگیا۔ مگر اس وقت وہ جو کچھ پہلے بظاہر جان کے تحفظ کے لئے شہر چھوڑ چکا تھا وہ اس وقت خطرہ کی اتنی شدت کے ہنگام میں جب آس پاس کوئی بھی سہارا دینے والا نظر نہیں آتا اپنے موقف سے ایک گام بھی پیچھے نہیں ہٹتا۔ زخمی ہوجاتے ہیں، چہرہ خون سے تر ہوجاتا ہے خود کی کڑیاں ٹوٹ کر سر کے اندر پیوست ہوجاتی ہیں۔ دندان مبارک مجروح ہو جاتے ہیں۔ مگر اپنی جگہ سے قدم نہیں ہٹاتے۔

اب کیا عقل و انصاف کی رو سے مکہ سے ہجرت کو خوف جان سے اس معنی میں سمجھا جاسکتا ہے جس سے شجاعت پر دھبہ آئے؟ ہرگز نہیں۔ یہی ہم نے پہلے کہا تھا کہ صرف اس عمل کو دیکھ کر جو رائے قائم کی جائے گی وہ گمراہی کا ثبوت ہوگی اس گمراہی کا پردہ اب اس وقت تو یقیناً چاک ہوجانا چاہئے۔ شجاعت رسولؐ کی حقیقی معرفت شیر خدا حضرت علی مرتضیٰؑ کو تھی۔ جنگ احد میں قتل محمدؐ کی آواز تھی جس نے کل فوج اسلام کے قدم اکھاڑ دیئے اور اس تصور نے علیؑ پر کیا اثر کیا۔ اسے خود آپ نے بعد میں بیان کیا ہے کہ میں نے نظر ڈالی تو رسول اللہؐ نظر نہ آئے میں نے دل میں کہا کہ دو ہی صورتیں ہیں یا وہ شہید ہوگئے اور یا اللہ نے عیسیٰؑ کی طرح انہیں آسمان پر اٹھالیا دونوں صورتوں میں میں اب زندہ رہ کر کیا کروں گا بس یہ سوچنا تھا اور نیام توڑ کر پھینک دیا اور تلوار لے کر فوج میں ڈوب گئے۔ جب فوج ہٹی تو رسولؐ نظر آئے۔ دیکھنے کی یہ چیز ہے کہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کو صرف یہی دو تصور ہوئے رسول شہید ہوگئے یا خدا نے آسمان پر اٹھالیا۔ یہ تو ہم بھی نہیں ہوا کہ شاید رسولؐ بھی میدان سے کسی گوشۂ عافیت کی طرف چلے گئے

ہوں۔ یہ علیؑ کا ایمان ہے رسولؐ کی شجاعت پر۔ عیسائیوں نے رسولؐ کی تصویر صرف اسی دور جنگ آزمائی کی یوں کھینچی کہ ایک ہاتھ میں قرآن ہے اور ایک ہاتھ میں تلوار۔ مگر جس طرح رسولؐ کی صرف اس زندگی کو سامنے رکھ کر وہ رائے قائم کرنا غلط تھا کہ آپ مطلق عدم تشدد کے حامی ہیں یا سینہ میں وہ دل ہی نہیں رکھتے جو معرکہ آرائی کر سکے اسی طرح صرف اس دوسرے دور کو سامنے رکھکر یہ تصویر کھینچنا بھی ظلم ہے کہ بس قرآن ہے اور تلوار۔ آخر یہ کس کی تصویر ہے؟ محمد مصطفیٰؐ کی نا؟ تو محمد نام تو اس پوری سیرت کی مالک ذات کا ہے جس میں وہ چالیس برس بھی ہیں اور وہ تیرہ برس بھی ہیں اور اب یہ دس برس بھی ہیں پھر اس ذات کی صحیح تصویر تو وہ ہوگی جو زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو دکھا سکے۔ یہ صرف ایک پہلو کو نمایاں کرنے والی تصویر تو حضرت محمد مصطفیٰؐ کی نہیں سمجھی جا سکتی۔

پھر اس دس برس میں بھی بدر واحد، خندق وخیبر سے آگے بڑھکر ذرا حدیبیہ تک بھی تو آیئے۔ یہاں پیغمبرؐ کسی جنگ کے ارادہ سے نہیں بلکہ حج کی نیت سے مکہ معظّمہ کی جانب آرہے ہیں ساتھ میں وہی بلند حوصلہ فتوحات حاصل کئے ہوئے سپاہی ہیں جو ہر میدان سر کرتے رہے ہیں اور سامنے مکہ میں وہی شکست خوردہ جماعت ہے جو ہر میدان میں ہارتی رہی ہے اور اس وقت وہ بالکل غیر منظم اور غیر مرتب بھی ہے پھر بھی انکی حرکت مذبوحی ہے کہ وہ سدراہ ہوتے ہیں کہ ہم حج کرنے نہ دینگے عرب کے بین القبائلی قانون کی رو سے حج کا حق کعبہ میں ہر ایک کو تھا ان کا رسول کے سدراہ ہونا اصولی طور اس کے بعد بھی انھوں نے چین لینے نہ دیا بلکہ جب تک دم میں دم رہا بار بار خونریز حملہ کرتے رہے جس میں کتنے ہی عزیز اور دوست خاک وخون میں تڑپتے نظر آئے خصوصیت کے ساتھ اپنے ہمدرد چچا جناب حمزہ کا بعد قتل سینہ چاک ہوتے دیکھنا آج وہی جماعت سامنے تھی اور بالکل بے بس، اپنے قبضہ میں یہ وقت تھا کہ انکے گذشتہ تمام بہیمانہ حرکات کی آج سزا دی جاتی، مگر اس مجسم رحمت الٰہی نے جب انہیں بے بس پایا تو عام اعلان معافی کر دیا۔ اور ایک قطرہ خون زمین پر گرنے نہ دیا۔

اب دنیا بتائے کہ پیغمبرؐ جنگ پسند تھے یا امن پسند، حقیقتاً انکی جنگ یا صلح کوئی بھی جذبات کی بنا پر نہ تھی بلکہ فرائض کے ماتحت کام ہوتا تھا جس وقت فرض کا تقاضا خاموشی تھی خاموش رہے اور جب حالات کے بدلنے سے ضرورت جنگ کی پڑ گئی جنگ کرنے لگے پھر جب امکان صلح پیدا ہو گیا اور بلندی اخلاق کا تقاضا صلح کرنا ہوا تو صلح کر لی۔ اور جب دشمن بالکل بے بس ہو گیا تو عفو وکرم سے کام لیکر اسے معاف کر دیا۔

یہ سب باختلاف حالات فرائض کی تبدیلیاں ہیں جو آپ کے کردار میں نمایاں ہوتی رہی ہیں۔

فرائض کی یہی پابندی طبیعت کے دباؤ سے جتنی آزاد ہو وہی معراج انسانیت ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کا اسلوب تبلیغ

آیۃ اللہ شہید مرتضیٰ مطہری طاب ثراہ

رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ اور آنحضرتؐ کی مقدس سیرت کا ایک ضروری سبق، دین کی تبلیغ اور لوگوں کو راہ پروردگار سے آشنا کرنے کا اسلوب ہے۔ شاید ابتدا میں لوگوں کی نظر میں یہ کام بہت چھوٹا کام نظر آئے۔ عوام کو راہ حق پر چلنے اور انہیں ان کے پروردگار کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دینا نیز ایک الٰہی پیغام کا پہونچانا، عام پیغام رسانی اور دعوت و تبلیغ سے کیا فرق رکھتا ہے؟

پہلے اس سلسلہ میں قرآن کے نقطۂ نظر کی وضاحت ضروری ہے کہ قرآن اس عمل کو کتنا اہم، سخت اور دشوار جانتا ہے۔ اسکے بعد الٰہی دعوت و تبلیغ اور عام پیغام رسانی کا فرق اجاگر ہوگا۔

اہمیت تبلیغ اور حضرت موسیٰؑ:

قرآن مجید نے سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ کے سلسلہ میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ مصر سے واپس آنے لگے تو راستہ میں ان کی اہلیہ کو دردِ زہ شروع ہوگیا۔ جناب موسیٰ اپنی اہلیہ کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھنے کے لیے آگ کی تلاش میں نکلے لیکن وادیٔ مقدس میں ان پر نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی اور فرعون اور فرعونیوں تک الٰہی پیغام پہونچانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔

حضرت موسیٰ کوئی عام انسان نہیں بلکہ اتنی عظمتوں کے مالک ہیں کہ خدا نے انہیں نبوت کے اہم منصب پر فائز کیا ہے۔ جب اس جلیل القدر اور غیر معمولی شخصیت کو خداوند عالم فرعون کو پیغام پہونچانے کا حکم دیتا ہے تو انہیں یہ ذمہ داری بہت بھاری بوجھ محسوس ہوتی ہے اور اس مشکل و سنگین ذمہ داری سے بحسن خوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے خدا سے نصرت و مدد طلب کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں: **رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ**۔ پروردگار مجھے شرح عطا کر دے کہ تمام مشکلات کو تحمل کرلوں۔ مجھے غیر معمولی قوت برداشت دیدے۔ میرے کام کو آسان بنا دے۔ حضرت موسیٰ محسوس کر رہے تھے کہ یہ کام بہت مشکل کام ہے۔ **وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ**۔ میری زبان کی گرہ کھول دے۔ بعض لوگوں نے اس جملہ کا یہ مطلب نکالا ہے کہ حضرت موسیٰ ہکلاتے یا تتلاتے تھے مثلاً سین کو اچھی طرح سے تلفظ نہیں کر پاتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ بچہ تھے فرعون نے آپ کو آزمانے کیلئے انگارہ لا کر رکھ دیا تھا اور آپ نے وہ انگارہ اپنے منھ میں رکھ لیا تھا اسی وقت سے آپ کی زبان میں لکنت پیدا ہوگئی تھی۔ میرے خیال میں ان باتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے ''زبان کی گرہ کھول دینے'' سے

مراد بظاہر وہی ہے جس کی تاکید قرآن مجید نے بار بار کی ہے کہ پیغمبر کی تبلیغ وپیغام رسانی واضح، آشکار اور مبیّن ہونی چاہیے۔ اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ اس کے بعد حضرت موسیٰ فرماتے ہیں یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ تاکہ لوگ میری باتیں سمجھ سکیں۔ میں تیرا پیغام لوگوں کو سمجھا سکوں۔ ان کے قلب وذہن میں اسے اچھی طرح اتار سکوں۔ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ھَارُوْنَ اَخِی وَاشْدُدْبِہٖ اَزْرِیْ وَاشْرِکْہُ فِیْٓاَمْرِیْ کَیْ نُسَبِّحَکَ کَثِیْرًا وَنَذْکُرَکَ کَثِیْرًا۔ اے میرے پروردگار یہ بوجھ میرے لیے بہت بھاری ہے، میرے لیے مددگار بھیج دے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر ومددگار بنا اور انہیں اس کام میں میرا شریک قرار دے۔

کیوں؟ تاکہ کار تبلیغ بہتر طریقہ سے انجام پا سکے مفید تر نتائج برآمد ہو سکیں ورنہ نعوذ باللہ مقصود نافرمانی وسرتابی نہیں ہے۔ تن تنہا بھی جانے کے لیے تیار ہوں۔

اہمیت تبلیغ اور مرسل اعظمؐ

قرآن مجید میں دوسرے مقام پر فریضۂ تبلیغ کی سنگینی، آنحضرتؐ کو خطاب کر کے بیان کی گئی ہے۔ یہاں رسول اکرمؐ کے سوال کی شکل میں نہیں ہے بلکہ خداوند عالم ایک انجام شدہ امر کو بیان کر رہا ہے۔ سورۂ انشراح میں ارشاد ہو رہا ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ۔ کیا ہم نے آپ کو شرح صدر عطا نہیں کیا؟ حضرت موسیٰ نے شرح صدر کا تقاضا کیا تھا لیکن آنحضرتؐ کے سلسلہ میں ایک انجام شدہ امر کی شکل میں بیان کیا جا رہا ہے کہ کیا ہم نے آپ کو شرح صدر عطا نہیں کیا ہے؟ بے پناہ قوت برداشت نہیں دی ہے۔ شرط تبلیغ وسیع النظری وقوت برداشت ہے اور ہم نے اس شرط سے آپ کو مالا مال کر دیا ہے وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ اور یہ بھاری بوجھ ہم نے آپ کی پشت پر سے اٹھا لیا۔ وہاں حضرت موسیٰ نے کہا تھا وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ اس بھاری بوجھ کو میرے لیے آسان بنا دے یہاں خدا کہہ رہا ہے اس بھاری بوجھ کو میں نے آپ کی پشت سے ہٹا لیا اَلَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ وہ بوجھ جو اتنا بھاری تھا کہ آپ کی کمر کو توڑے دے رہا تھا۔ خطاب خاتم الانبیاؐ سے ہے اور بوجھ بھی دعوت وتبلیغ کا بوجھ ہے، ان لوگوں کے سامنے پیغام حق پیش کرنے کا بوجھ ہے، جنہیں ہدایت ورہنمائی کر کے پروردگار کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ یہ اتنا مشکل کام ہے کہ قرآن کے بقول پیغمبرؐ کی کمر توڑے دے رہا تھا۔ "اَنْقَضَ" کا لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب مثلاً لکڑی سے بنی کسی چھت پر بہت زیادہ بوجھ لادہ جائے اور بوجھ کے دباؤ سے لکڑیاں چر چرانے لگیں۔ قرآن گویا یہ کہنا چاہتا ہے کہ دعوت وتبلیغ کا بوجھ اتنا سنگین تھا کہ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ آپ کی کمر کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز سنائی دینے لگی وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ اور ہم نے آپ کا نام بلند کر دیا۔ یہ عمل کا اثر اور نتیجہ ہے۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ۔ اے میرے حبیب! کام بہت سخت ہے لیکن اگر انسان سختیاں جھیل لے۔ مشکلیں برداشت کر لے تو سختیوں کے

ساتھ آسانیاں بھی ہیں سختیوں کے پیٹ میں آسانیاں بھی ہوتی ہیں۔ ہر مشکل اپنے ساتھ سہولت بھی لاتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ صبر کیجیے۔ ثابت قدم رہیے۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا پھر اسی کی تاکید کی گئی ہے اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اس آیت سے پیغمبر کو یہ احساس ہوا کہ ہر سختی کے ساتھ دو آسانیاں ہوں گی چنانچہ آپ کا چہرہ کھل اٹھا اور بار بار فرمایا کرتے تھے ایک سختی کے ساتھ دو آسانیاں ہیں۔ میرے خدا نے مجھ سے آسانی و سہولت کا وعدہ کیا ہے۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ اگر ان آیتوں اور حضرت موسیٰ سے متعلق آیتوں کا آپس میں موازنہ کریں اور پھر پیغمبرؐ کی اس متواتر حدیث کو بھی مدنظر رکھیں جو شیعہ سنی دونوں کے یہاں مشہور ہے کہ پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کو مخاطب کر کے فرمایا: اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی اے علی تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے منصب خلافت ووصایت کی طرف اشارہ ہے اور روایتوں سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے۔

ایک اور آیت جس سے دعوت و تبلیغ اور الٰہی پیغام رسانی کی غیر معمولی اہمیت نیز اس کے انتہائی مشکل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ سورۂ مزمّل کی ایک آیت ہے۔ یہ سورہ ابتدائے بعثت میں نازل ہونے والے سوروں میں سے ہے: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ہم عنقریب تمہارے اوپر ایک بھاری قول نازل کرنے والے ہیں۔ بھاری قول سے کیا مراد ہے؟ قول، قول ہونے کے لحاظ سے ہلکا اور بھاری نہیں ہوتا بلکہ قول کے اندر چھپا ہوا مضمون یا اس مضمون کا نفاذ آسان اور مشکل ہوسکتا ہے۔ ہم بھی اپنی روزمرہ کی بول چال میں بعض اوقات کہتے ہیں فلاں شخص نے فلاں کو بہت سخت بات کہہ دی۔ یعنی ایسی بات جس کے معنی و مفہوم کو برداشت کرنا اس کیلئے مشکل ہوسکتا ہے۔ یا یہ کہتے ہیں کہ بہت بھاری ذمہ داری ہمارے سپرد کردی گئی ہے۔ کسی کو ایک حکم کے ذریعہ کسی کام کی بجا آوری کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے وہ کہتا ہے مجھے بہت بھاری ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

ذمہ داری کے بھاری ہونے سے کیا مراد ہے۔ خط وغیرہ تو ہلکا بھاری نہیں ہوتا۔ گفتگو خود اس کے ہلکے یا بھاری ہونے کی نہیں ہے بلکہ گفتگو اس ذمہ داری کے مفہوم اور اس کے نفاذ کی ہے۔ اگر کام، دشوار کام ہو تو کہتے ہیں ذمہ داری بھاری ہے۔ قرآن کہتا ہے: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ہم عنقریب آپ پر بھاری قول نازل کریں گے۔ اس سے مراد تبلیغ ودعوت اور عوام کی ہدایت کی ذمہ داری کے سوا کچھ نہیں ہے۔

تبلیغ دشوار کیوں؟

ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو جائے کہ قرآن، دعوت و تبلیغ کو اتنا مشکل کام کیوں بتا رہا ہے؟ بعض مسائل ایسے ہیں جن کی قدر و قیمت سے ہم واقعتا آگاہ ہیں اور چونکہ اس کی قیمت سمجھ چکے ہیں لہٰذا اسے اس کے مقام و منزلت کے

لحاظ سے پہچانتے ہیں مثلاً ''افتاء'' یعنی فتویٰ دینا۔ خوش قسمتی سے ہمارے سماج کے ۹۵ ؍فیصد افراد جانتے ہیں کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے اسی لیے جلدی کسی میں دعوائے اجتہاد کی جرئت پیدا نہیں ہوتی اور اگر کسی میں یہ خواہش انگڑائی لینے بھی لگے اور وہ یہ دعویٰ کر بیٹھے تو سماج جلدی اس کے دعوے کو قبول نہیں کرتا کیوں کہ سماج کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ اجتہاد وفتویٰ بہت بڑا مقام ہے۔لیکن جہاں تک تبلیغ، دعوت، ہدایت اور لوگوں کو خدا کی طرف بلانے کا مسئلہ ہے، انسان کو آگے برھانے کا معاملہ ہے وہ بھی کس سمت میں؟ چراگاہ کی طرف؟ بہت سے مکاتب فکر انسان کو آگے بڑھاتے ہیں اور اچھی طرح آگے بڑھاتے ہیں مگر کس سمت میں؟ وہ اسے چراگاہ کی طرف لے جاتے ہیں اس کے مادّی مفادات کی طرف لے جاتے ہیں یا تھوڑا سا اسے تقدس دے کر کہیں اس کے حقوق کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہاں تک ہم بھی اس کے ساتھ ہیں۔ ہمارے پیغمبر بھی لوگوں کو اپنا حق حاصل کرنے کی طرف لے جاتے تھے۔حق کا حصول انبیاءؑ کے مقاصد کا جزو ہے۔لیکن یہ چھوٹا قدم ہے۔ظالموں سے اپنا حق چھیننے کے لے عوام کو آگے بڑھانا یہ انبیاء کا چھوٹا اقدام ہے۔ چونکہ یہ ایسا اقدام ہے جس کی انسان کے مفادات بھی تائید کرتے ہیں۔انسان کا فطری رجحان بھی اس کی حمایت کرتا ہے ''مظلومو! ستم کشو اٹھو متحد ہو کر ظالموں سے اپنا حق چھین لو'' اس نعرہ میں کشش ہے لہٰذا اس راستہ پر انسان کو لگانا آسان ہے۔ میں اس اقدام کی اہمیت کا منکر نہیں ہوں۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے لیکن انبیاء کے منصوبہ کے لحاظ سے یہ ان کا ایک چھوٹا کام ہے انبیاء نے بھی یہ کام کیا ہے اور دوسروں سے بہتر انداز میں کیا ہے لیکن ان کے دوسرے کاموں کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

انبیاءؑ نے انسانوں میں جو عظیم تحرّک پیدا کیا ہے وہ انسان کو منزل نفس سے حق کی طرف آگے بڑھانا ہے۔ انسانوں کو اپنے نفس کی زنجیروں سے چھٹکارا دلا کر حق سے وابسطہ کرانا ہے۔ انسان کو خود اپنے خلاف انقلاب پر آمادہ کرنا ہے۔ یہ صرف ایک مظلوم کو دوسرے مظلوم کے خلاف کمر بستہ کرنا ہی نہیں بلکہ خود اپنے خلاف بھی صف آرا کرنا ہے۔اسی کو توبہ کہتے ہیں۔خود پرستی ومفاد پرستی کی منزل سے آگے بڑھ کر حقیقت پرستی کی جانب سفر کہتے ہیں۔ یہ مشکل کام ہے۔اگر اس میدان میں کوئی انبیاءؑ کا مقابلہ کر سکے تب اسے خاطر میں لایا جا سکتا ہے۔فلاں انقلابی لیڈر نے عوام کو تحریک دی ہے۔انہیں میدان میں کھڑا کر دیا ہے۔ اپنے مفادات کے حصول کے لیے۔ اپنا حق لینے کے لیے یہ ایک مقدس کام ہے۔ بہت بڑا کام ہے لیکن انبیاءؑ کے کام کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے۔

انبیاءؑ کا عمل جس کی ہر مبلغ ہر داعی الی اللہ اور ہر ہادی کو تأسی کرنی چاہیئے۔ بہت مشکل کام ہے کیونکہ یہ انسان کو خود پسندی، نفس پرستی، نفع پرستی کی زمین سے اکھاڑ کر حق پرستی وحقیقت پرستی کی وادی میں لے جانا ہے۔ اور یہ نہایت دشوار

کام ہے۔

ہم لوگوں نے بعض کاموں کی قدر و قیمت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور اس کی رعایت بھی کرتے ہیں لیکن یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ بہت سے ایسے مسائل اور بہت سے ایسے کام ہیں جن کی حقیقی قدر و قیمت اور واقعی عظمت و منزلت سے ناواقف ہیں۔

قرآن مجید نے دعوت و تبلیغ کے عمل کو نہایت سخت و دشوار عمل کی شکل میں پیش کیا ہے۔ خدا اور پیغمبر کے مابین بہت سے مسائل ہیں جنہیں خداوند عالم نے عام لوگوں کے سامنے بیان نہیں کیا ہے ان سے صرف خدا و پیغمبرؐ ہی واقف ہیں لیکن عمل تبلیغ کی دشواریوں کو خدا صرف اپنے پیغمبر کی ذات تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے اس طرح سے اپنے حبیب سے بیان کرتا ہے کہ ساری امت اس سے آگاہ ہو جائے۔ یہ امت کو سمجھانے کی کیا ضرورت تھی؟ سب کے سامنے اسے عیاں کیوں کر دیا؟ اس لئے کہ اس کا تعلق ساری امت سے ہے جن مسائل کو خدا نے اپنے حبیب اور اپنے پیغمبرؐ کے درمیان محدود رکھا اور امت کو ان سے باخبر نہیں کیا وہ مسائل تھے جن کا تعلق عام لوگوں سے نہیں تھا لیکن جب کوئی مسئلہ عمومی طور پر بیان ہوتا ہے تو یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ سب کے لئے ہے اور سب کو سیکھنا چاہیے پوری امت کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ دعوت و تبلیغ کے میدان میں قرآن کا ہمیں پہلا سبق یہ ہے کہ تبلیغ کی پہلی شرط شرح صدر کشادہ دلی ہے۔ تبلیغ کا لازمہ اعلیٰ ظرف اور بڑا دل ہے۔

پیغام۔عقل کے لیے:

ممکن ہے یہ پوچھا جائے کہ پیغام پہنچانا اتنا مشکل کیسے ہو گیا ہے؟ ہر پیغام رسانی مشکل نہیں ہے۔ حسّی ابلاغ و پیغام رسانی اتنی مشکل نہیں ہوتی۔ ظاہری احساس تک پیغام پہونچا دینا مشکل نہیں ہے۔ عدلیہ کا نمائندہ بھی پیغام پہونچاتا ہے، کسی ملزم تک سمن پہونچاتا ہے لیکن یہ پیغام رسانی ظاہری احساس تک پیغام رسانی ہے۔ آنکھ کان تک پیغام رسانی ہے، یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہر شخص کر سکتا ہے۔ لیکن کیا پیغمبروں کا کام صرف لوگوں کو پیغام حق سنا دینا ہے۔ ان کے گوش گذار کر دینا ہے، صرف انہیں ان ہی ظاہری آنکھوں سے دکھا دینا ہے؟ نہیں انبیاءؑ کی ذمہ داری اس سے کہیں بڑی ہے آنکھ اور کان سے آگے بڑھ کر عقل و فکر تک پیغام پہونچانا ہے۔ پیغام کو اس انداز سے پیش کرنا، اس انداز سے بیان کرنا کہ پیغام دل کی گہرائیوں میں اتر جائے اور عقل قبول کر لے۔ آنکھوں سے نظر آنے والی چیز کی حقانیت، ضروری نہیں ہے کہ عقل بھی قبول کر لے۔ انسان کانوں سے جو کچھ سنتا ہے ضروری نہیں ہے کہ عقل بھی اسے تسلیم کر لے۔ پیغام کو عقل تک پہونچانے کا ذریعہ آواز، شکل یا تحریر نہیں ہے۔ وہ ایک دوسری ہی چیز ہے۔ کیا ہے وہ چیز؟ عقل، نے اپنے دروازے بند کر رکھے ہیں، اسے کھولنے کیلئے استدلال، برہان اور قرآن کی لفظوں میں حکمت کی ضرورت ہے۔ عقل صرف اسی پیغام

کوقبول کرتی ہے جو حکمت کے ہمراہ ہو۔انبیائے الٰہی پہلے مرحلہ میں اپنا پیغام عقلوں تک پہونچانا چاہتے ہیں۔

عیسائیت۔تحریف شدہ دین:

اگر عیسائیت اسکے برخلاف اقدام کرتی ہے اور کہتی ہے ''ایمان، عقل سے تعلق نہیں رکھتا'' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت تحریف ہو چکی ہے، اس کا چہرہ مسخ ہو چکا ہے۔حقیقی عیسائیت میں ایسی باتیں نہیں پائی جاتیں۔اصل عیسائیت میں نہ تثلیث کا وجود ہے اور نہ تثلیث کو قبول نہ کرنے والی عقل سے جنگ کا اعلان ہے۔یہ تحریف شدہ عیسائیت ہے جس نے پہلے تثلیث کے عقیدہ کو جنم دیا اور جب یہ دیکھا کہ عقل اس عقیدہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو کہنے لگی ''ایمان کا معاملہ عقل سے جدا ہے، ایمان عقل کے لئے شجر ممنوعہ ہے اور عقل ایمان کے لئے، نہ عقل کو ایمان کے دائرہ میں قدم رکھنے کی اجازت ہے اور نہ ایمان کو عقل کے دائرہ میں۔یہ عیسائیت کی تحریف کی دین ہے ورنہ کسی نبی، کسی پیغمبر نے ایسی بات نہیں کہی ہے۔قرآن مجید جو تمام انبیاء کی تعلیمات کا امین ہے۔کہتا ہے:

''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ''

اپنے پروردگار کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ دعوت دو۔دعوت کا پہلا وسیلہ حکمت ہے۔نحل/ ۱۲۵

''یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا'' اے پیغمبر ہم نے آپ کو اس امت کے لئے گواہ بنا کر بھیجا ہے، بشارت دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔آپ انہیں خوشخبری دیں۔انہیں شوق دلایئے اس راہ پر چلنے کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے اعلیٰ نتائج کی بشارت دیجئے ہم نے آپ کو نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ ''نذیر'' کے معنی ڈرانے والا نہیں ہے۔ڈرانے والا ''مُخَوِّف'' کا ترجمہ ہے، نذیر کا معنی ''خطرہ سے ہوشیار کرنے والا'' ہے جو ڈرانے والے سے اخص ہے۔ممکن ہے کسی انسان کو کسی چیز سے ڈرا دیا جائے مثلاً کسی خوفناک آواز سے لیکن اسے انذار نہیں کہا جاسکتا۔انذار ایسے ڈرانے کو کہا جاتا ہے جس میں خطرہ کا اعلان بھی ہو۔مثلاً کوئی شخص کسی راستہ سے جارہا ہو اور کوئی آکر اس سے کہے کہ: آگے چل کر اس راستہ پر فلاں قسم کے خطرات پائے جاتے ہیں۔

قرآن مجید کہتا ہے :اے پیغمبرؐ ہم نے آپ کو خطروں سے آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے پیغمبر اسلامؐ نے اپنی بعثت کے ابتدائی دنوں میں صفا کے مقام پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے فرمایا تھا: ''یَاصَبَاحَا'' یعنی خطرہ! خطرہ! (اس زمانہ میں کسی خطرہ کے اعلان کا یہی طریقہ تھا) لوگ یہ آواز سن کر وادی صفا میں جمع ہو گئے اور خطرہ کے متعلق استفسار کرنے لگے محمدؐ امین کی زبان سے پہلی مرتبہ خطرہ کا اعلان سن رہے تھے لہٰذا ہر زبان پر یہی سوال تھا کیا ہوا؟ کیسا خطرہ؟ کیا عام الفیل جیسا کوئی واقعہ پیش آ گیا ہے؟

آنحضرتؐ نے جواب دینے سے پہلے اپنی صداقت وامانت کی تصدیق چاہتے ہوئے فرمایا:

''اے لوگو! تم نے مجھے کیسا پایا ہے؟'' سب نے کہا: صادق و امین۔ آنحضرتؐ نے فرمایا اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے دشمن اپنے لشکر جرار کے ہمراہ آپہونچا ہے اور وہ تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو میری بات کا یقین کرو گے؟ سب نے جواب دیا: ضرور ضرور جب اپنی صداقت کی گواہی لے چکے تو فرمایا ''فَاِنِّیْ نَذِیْرٌ لَکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ'' میں تم کو اس خطرہ سے آگاہ کرتا ہوں جو تمہارے راستہ میں موجود ہے۔ تم لوگ جس راستہ پر چل رہے ہو اس کا انجام دنیا و آخرت میں شدید الٰہی عذاب ہے۔

پس قرآن مجید رسولؐ کی ایک صفت نذیر بتاتا ہے۔ ''اِنَّا اَرْسَلْنَاکَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ'' آپ لوگوں کو پروردگار کے نام سے پروردگار کی طرف بلانے آئے ہیں۔

آپ لوگوں کو پروردگار کی طرف بڑھاتے ہیں، آپ داعی الی اللہ ہیں۔

یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ لوگوں کو کس طرح سے اللہ کی طرف بلایا جاسکتا ہے؟ اس کا وسیلہ کیا ہے؟ قرآن مجید نے راستہ بھی معین کر دیا ہے۔ خدا کی طرف دعوت، کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کی طرف دعوت ہے۔ اس چیز کی طرف دعوت ہے جس کے ذریعہ انسان کی عقلوں کی ہدایت کی جاسکتی ہے اور اس کا رخ اس طرف موڑا جاسکتا ہے۔ ایک ایسی چیز کی جانب دعوت ہے جسے عقلوں کو برہان، استدلال، حکمت اور منطقی دلائل کے ذریعہ قبول کرنا چاہیئے۔ یہ وہ پہلو ہے جو تبلیغ و دعوت کے کام کو مشکل بنا دیتا ہے۔

عقل کا مان لینا کافی نہیں:

پیغمبروں کی دعوت کا صرف ظاہری احساس تک پہنچنا کافی نہیں ہے بلکہ اسے عقل تک پہنچنا چاہیے لیکن کیا عقل تک پہنچ جانا ہی کافی ہے۔ عقل کا تسلیم کر لینا کافی ہے؟ نہیں یہ تو تبلیغ و دعوت کا پہلا مرحلہ ہے۔

ایک استاد کی صرف اتنی ہی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنا علم طالب علم کی عقل کے سپرد کر دے۔ جب استاد بلیک بورڈ پر ریاضی کے کسی مسئلہ کو پیش کرتا ہے تو شروع میں طالب علم کی عقل نہیں جانتی ہے کہ یہ مسئلہ واقعاً ایسا ہی ہے یا نہیں لیکن جب استاد ریاضی کی دلیلیں اور براہین پیش کرتا ہے تب، اس کی عقل اس مسئلہ کو قبول کر لیتی ہے۔ لیکن انبیاء کا مقصد صرف لوگوں کی عقلوں سے تسلیم کروانا نہیں ہے۔ فلاسفہ کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہوتی ہے کہ ان کی باتیں لوگوں کے ذہنوں میں اتر جائیں ان کی عقل تسلیم کر لے۔ لیکن الٰہی پیغام کا صرف ذہن میں اتر جانا کافی نہیں ہے بلکہ دل میں اترنا بھی ضروری ہے صرف عقل کا تسلیم کر لینا کافی نہیں ہے قلب کی گہرائیوں میں جگہ بنانا بھی ضروری ہے۔ انسان کے پورے وجود کو اپنے قبضہ میں لینا ضروری ہے۔ لہٰذا یہ صرف پیغمبرؐ ہی ہیں جو انسانوں کو حق و حقیقت کی شاہراہ پر گامزن کر سکتے ہیں یہ کام، فلاسفہ کے بس کی بات نہیں ہے۔

انبیاء اور فلاسفہ میں فرق:

فلسفی کسی بات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی عقل تک پہنچا سکتا ہے وہ بھی تمام لوگوں کی عقل تک نہیں۔ بلکہ صرف وہی لوگ جو اس کے شاگرد ہیں اور اس کیلئے بھی شاگردوں کو چند برس تک محنت ومشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ ان فلاسفہ کی زبان سمجھنے ہی کے لئے برسوں درکار ہیں کیوں کہ ان کا ابلاغ، بلاغ مبین نہیں ہوتا۔ ان میں بلاغ مبین کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی انہیں اپنی بات سیکڑوں اصطلاحوں کے بھیس میں بیان کرنی پڑتی ہے۔

ہمارے ایک عظیم استاد فرمایا کرتے تھے کہ فلسفی جو امکان ذاتی، امکان استدلالی، امکان استعدادی، واجب الوجود بالذات، عقل اول، عقل دوم وغیرہ جیسی اتنی ساری اصطلاحوں کا ڈھیر لگا تا ہے یہ اس کی عاجزی وناتوانی کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ وہ ان اصطلاحوں کے سہارے کے بغیر اپنی بات کہہ نہیں سکتا یہ اس کی عاجزی کی نشانی ہے۔

لیکن انبیاء ان ہی حقائق کو ان سیکڑوں اصطلاحوں کا سہارا لئے بغیر اپنے بیان مبین کے ذریعہ صرف دو جملوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ فلسفی حیران رہ جاتا ہے کہ اتنی آسانی سے یہ بات کیسے بیان ہوگئی ہے۔ یہ سہل ممتنع کیسے وجود میں آ گیا مثلاً قرآن مجید میں ہے: ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ، لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ'' اے رسول کہہ دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ برحق وبے نیاز ہے۔ اس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ والد اور نہ اسکا کوئی کفو وہمسر ہے۔

''سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ'' سورۂ حدید/۱۔۳۔

زمین وآسمان میں موجود ہر چیز اللہ کی تسبیح پڑھ رہی ہے اور وہ صاحب عزت وحکمت ہے۔ آسمان وزمین کا کل اختیار اسی کے پاس ہے وہی حیات وموت کا دینے والا ہے اور ہر شئ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہی اول وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے وہی باطن اور وہی ہر شئ کا جاننے والا ہے۔

کتنے عمیق مسائل کتنی آسانی سے بیان کر دیے گئے ہیں پس پیغمبران، اپنا پیغام عوام تک فلاسفہ سے بہتر انداز میں بھی پہنچاتے ہیں اور اس سے عظیم کام یہ کرتے ہیں کہ اپنا پیغام دلوں تک پہنچاتے ہیں روح کی گہرائیوں میں پیوست کر دیتے ہیں۔ جو شخص کسی پیغمبرؐ پر ایمان لاتا ہے اس کا پورا وجود اس پیغمبرؐ سے وابستہ ہو جاتا ہے۔

بوعلی اور بہمنیار:

بوعلی سینا اور بہمنیار کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ بوعلی سینا بہت عظیم فلسفی ودانشور تھے طب وفلسفہ میں یدطولیٰ رکھتے تھے غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ ہوش و ذکاوت، عقل و فراست کے علاوہ آنکھ کان جیسے ان کے ظاہری قوا بھی غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ ان کی ان صلاحیتوں کے بارے میں لوگ بہت سے افسانے بیان کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ ابوعلی سینا

اصفہان میں تھے اور وہ وہاں سے کوسوں دور کاشان میں تانبے کے برتن پر کام کرنے والے کاریگروں کے ہتھوڑوں کی آواز سنتے تھے۔ یہ سب افسانے ہیں لیکن افسانے بھی وہیں بنائے جاتے ہیں جہاں ذہن کے قبول کرنے کے لئے زمین ہموار ہو۔

بہمنیار ان کے شاگرد تھے وہ بوعلی سینا سے کہا کرتے تھے آپ اتنی عظمتوں کے مالک ہیں اگر آپ نبوت کا دعویٰ کردیں تو لوگ اسے تسلیم کرلیں گے اور خلوص دل سے ایمان لائیں گے۔ بوعلی انہیں سمجھاتے تھے کہ ناممکن ہے لیکن بہمنیار بوعلی کے جواب سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ ایک دن بوعلی نے عملاً انہیں سمجھانا چاہا کہ تمہاری تجویز غلط و نامعقول ہے۔

جاڑے کا موسم تھا، استاد و شاگرد دونوں سفر میں تھے، اس رات بھاری برف باری ہوئی تھی، صبح صادق کے وقت جب مؤذن مسجد میں اذان دے رہا تھا، بوعلی نے اپنے شاگرد رشید بہمنیار کو نیند سے اٹھا کر کہا مجھے پیاس لگی ہے باہر سے پانی لا کر مجھے پلا دو۔ بہمنیار نے جو کہ نرم، گرم لحاف کے نیچے دبکے ہوئے نیند کا مزہ لے رہے تھے دلیلیں پیش کرنا شروع کردیا کہ آپ تو خود حکیم ہیں آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ جس وقت معدہ میں التہاب ہو اگر ٹھنڈا پانی پی لیا جائے تو معدہ اچانک ٹھنڈا ہوجاتا ہے تو ممکن ہے آپ کسی بیماری میں مبتلا ہوجائیں۔ بوعلی نے کہا: میں حکیم ہوں تم میرے شاگرد ہو۔ مجھے پیاس لگی ہے جاؤ مجھے پانی لا کردو۔ اس نے پھر دلیلیں دینا اور بہانہ بنانا شروع کردیا کہ یہ صحیح ہے کہ میں آپ کا شاگرد ہوں لیکن میں آپ کی بھلائی چاہتا ہوں اور آپ کی بھلائی کا خیال رکھنا آپ کے حکم کی اطاعت سے بہتر ہے۔۔۔۔ بوعلی سینا نے کہا جب کسی کاہل انسان سے کوئی کام کہا جاتا ہے تو وہ پدرانہ نصیحتیں کرنے لگتا ہے۔

بہمنیار نے اپنی نصیحتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب بوعلی نے بہمنیار پر یہ اچھی طرح ثابت کردیا کہ وہ صرف کاہلی کے باعث بہانے بنا رہا ہے اصل بات یہ ہے کہ وہ اس شدید ٹھنڈک میں اپنا گرم بستر نہیں چھوڑنا چاہتا تو بہمنیار کو خطاب کر کے کہا: نہ میں پیاسا ہوں نہ مجھے پانی چاہیے میں تو صرف تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ تمہیں یاد ہے تم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ آپ نبوت کا دعویٰ کیوں نہیں کردیتے: اگر دعویٰ کردیں تو قبول کرلیں گے۔ میں اگر دعویٰ کردوں تو تم جو میرے شاگرد ہو کیا تم میرے دعوے کو قبول کرلو گے؟ برسوں تم نے میرے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے جب میں تم سے پانی مانگتا ہوں تو میری خواہش کو ٹالنے کے لئے دلیلیں پیش کرتے ہو۔ ذرا اس مؤذن کو دیکھو۔ پیغمبرؐ کی وفات کو سیکڑوں سال گزر چکے ہیں اپنا گرم بستر چھوڑ کر اس غضب کی سردی میں گلدستۂ اذان پر جا کر اذان دے رہا ہے اور موسم کی پرواہ کئے بغیر اعلان کررہا ہے۔ ''اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِؐ'' پیغمبر ایسے ہوتے ہیں نہ کہ مجھ بوعلی سینا جیسے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جب کسی الٰہی پیغام کو دلوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ دلوں کو اس پیغام کے قبضہ میں دینا ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ کسی سماج کو حرکت میں لانا

ہوتا ہے اور وہ بھی صرف اپنے حقوق ومفادات کی سمت میں نہیں بلکہ ایک ایسا اقدام جو انسان کو تائب بنا دے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری کردے۔ جب اس کے سامنے قرآنی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ پڑے ''یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا''۔ اسراء ر ۱۰۷۔ جب ان پر تلاوت ہوتی ہے تو منھ کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے نہایت دشوار اور سخت کام ہے۔

قرآن مجید اس سلسلہ میں انبیاء عظام اور مرسل اعظم کی زبانی کچھ مطالب نقل کرتا ہے بلکہ درحقیقت شرائط تبلیغ کو بیان کرتا ہے جن سے دعوت وتبلیغ کا اسلوب اور میتھڈ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

شرط وہی ہے جسے ہم بیان کرچکے ہیں کہ قرآن کریم نے متعدد آیتوں میں ''سخن بلاغ'' کی تعبیر پیش کی ہے ''بلاغ'' یعنی پیغام کا پہنچانا۔

بعض الفاظ بہت بدقسمت واقع ہوئے ہیں، ان کا بہت برا انجام ہوا ہے۔ لفظ تبلیغ کا ہمارے زمانہ میں۔ جدّت پسندوں کی اصطلاح میں۔ بہت برا انجام ہوا ہے۔ آج جیسے ہی لفظ تبلیغ زبان پر آتا ہے فوراً یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ اس میں کوئی حقیقت نہیں صرف جھوٹ اور فریب کے زور پر منوانا چاہتے ہیں لیکن یہ آج کی غلط اصطلاح ہے۔ میں بار بار یہ عرض کرچکا ہوں کہ اگر قرآن وحدیث میں کوئی صحیح اصطلاح پائی جاتی ہے جس کا مفہوم آج تبدیل ہو چکا ہے تو ہمیں اس اصطلاح سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے۔

بعض لوگ کہتے ہیں ہمیں اب لفظ تبلیغ کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ آج ہمارے دور میں (فارسی وعربی زبانوں میں) جب لفظ تبلیغ کا استعمال ہوتا ہے تو ذہن فوراً اس ایڈورٹائزمنٹ کی طرف جاتا ہے جو مختلف تجارتی سامانوں کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔ یعنی سفید جھوٹ، مثلاً فلاں قسم کے گھی کی جب تبلیغ کی جاتی ہے تو کہتے ہیں اگر ایک چمچہ گھی استعمال کرلیجئے تو صحرا میں ہرن کی طرح دوڑنے لگیں گے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ طاقت مل جائے گی۔ پس تبلیغ یعنی جھوٹ لہٰذا ہمیں اپنی دینی اصطلاح میں لفظ تبلیغ کا استعمال نہیں کرنا چاہئے ہم لفظ تبلیغ کا استعمال کیوں نہ کریں۔ جب قرآن نے اسے استعمال کیا ہے تو ہم کیوں گریز کریں۔ اگر کسی اچھے لفظ کو سماج غلط معنی میں استعمال کرنے لگے تو ہمیں اس لفظ سے دستبردار ہونے کے بجائے اسے اس کے اصل معنی ومفہوم کی طرف لوٹانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

یہ بتانا چاہئے کہ ہم اسے اس کے اصل معنی ومفہوم میں استعمال کررہے ہیں۔ قرآن اور لغت میں اس کے اصل معنی کی وضاحت کرنی چاہیے کہ تبلیغ، یعنی پیغام رسانی۔

پس قرآن نے لفظ بلاغ بھی استعمال کیا ہے اور ''بلاغ مبین'' بھی اس داعی ومبلغ کی تبلیغ نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے جس کی تبلیغ، بلاغ مبین ہو، اس کا بیان، حقائق کا آئینہ دار اور اعلیٰ مفاہیم کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ رواں، سادہ اور

واضح ہو۔ عام فہم ہو۔ عامۃ الناس اسے سمجھ سکیں۔

پیچیدہ بیان سے اجتناب:

بھاری بھرکم پیچیدہ الفاظ استعمال کرنے والا خطیب جس کی مجلس اور بیان کی خوب تعریف ہورہی ہو واہ! واہ! سبحان اللہ! کے فلک شگاف نعرے لگ رہے ہوں لیکن جب سامعین سے یہ پوچھا جائے کہ انھوں نے کیا بیان کیا ہے، تم کیا سمجھے تو وہ بغلیں جھانکنے لگیں، ایسا خطیب دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔

کہا جاتا ہے ایک صاحب کسی شخص کی تقریر سن کر آئے تھے۔ بہت تعریف کررہے تھے بار بار یہی کہتے تھے، آپ لوگوں کو نہیں معلوم کتنی اچھی تقریر تھی۔ کسی نے ان سے پوچھ لیا: آخر انھوں نے کیا کہا جس کی تم اتنی تعریف کررہے ہو۔ انھوں نے جواب دیا میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ انھوں نے کیا کہا ہے۔ اس نے کہا جب تمہاری سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں تو اس میں تعریف کی کیا بات تھی۔

تقریر کا اصل مقصد یہ ہے کہ جب سامعین وہاں سے اٹھیں تو کچھ لے کر اٹھیں کچھ سمجھ کے اٹھیں۔

اچھے مبلغ کی ایک شرط یہ ہے کہ جب سامعین اس کی تقریر سن کر اٹھیں تو ان کا دامن، علم ومعرفت سے پر ہو واقعاً کچھ سمجھ کر اٹھیں۔ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ جس مقرر کی بات سمجھ میں نہ آئے اس کی تقریر بہت عالمانہ ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ پیغمبر اکرمؐ جب کہیں تقریر فرماتے تھے تو آپ کی تقریر اتنے علمی نکات سے لبریز ہوتی تھی کہ جب صدیوں بعد اس میں غور وخوض کیا جاتا ہے تو ایسے ایسے مفاہیم و نکات سمجھ میں آتے ہیں جو اس دور والے نہیں سمجھ سکے تھے لیکن اس وقت کے تمام سامعین بھی آنحضرتؐ کی تقریر کو سمجھتے تھے۔ اپنی اپنی سمجھ اور صلاحیت کے مطابق آپ کی تقریر سے علم ومعرفت حاصل کرتے تھے۔ حضرت علیؑ کے خطبے، معارف کا خزانہ ہیں اس کے باوجود ان کے اندر اتنی سلاست و بلاغت پائی جاتی ہے کہ اس دور کے سامعین بھی اپنی ظرفیت کے بقدر اسے سمجھتے تھے اور اس سے استفادہ کرتے تھے۔

خلوص نیت:

قرآن مجید میں الٰہی مبلغوں اور داعیوں کی زبان سے ابلاغ وتبلیغ کے سلسلہ میں لفظ ''نصح'' کا بہت ذکر آیا ہے ''نصح''، یعنی خلوص دل کے ساتھ خیر خواہی، اس کے مقابلہ میں ''غش'' ہے جب کسی سامان میں ملاوٹ کردی جاتی ہے تو اسے ''غش'' کہتے ہیں۔

نصح، غش کے مقابلہ میں ہے۔ کلام وبیان میں نصح کا کیا مطلب ہے؟ بیان وسخن کے ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک ہونے کا کیا مطلب ہے؟

مطلب یہ ہے کہ مقرر، خطیب، داعی ومبلغ، صمیم قلب سے خیر خواہی کے جذبہ سے معمور ہوکر تبلیغ کرے۔ داعی الی اللہ اور الٰہی مبلغ وہی شخص ہوسکتا ہے جس کی تبلیغ و دعوت کا محرک عوام کی خیر خواہی اور ان کی مصلحت اندیشی کے سوا کوئی

اور جذبہ نہ ہو۔ اس کی تبلیغ دل کی آواز ہو کیونکہ ''اِنَّ الْکَلَامَ اِذَا خَرَجَ مِنَ الْقَلْبِ دَخَلَ فِی الْقَلْبِ وَاِذَا خَرَجَ مِنَ اللِّسَانِ لَمْ یَتَجَاوَزِ الآذَانِ'' جب بات دل سے نکلتی ہے تو دل پر اثر کرتی ہے اور جب زبان سے نکلتی ہے تو کان سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہ الٰہی پیغام رسانی کے لئے ضروری ہے غیر الٰہی پیغام رسانی کے لئے ایسی کوئی شرط نہیں ہے۔

پیغامبران الٰہی ہمیشہ یہی کہتے تھے ''اِنِّیْ اَنْصَحُ لَکُمْ'' ''اِنِّیْ نَاصِحٌ لَکُمْ'' ''وَاِنِّیْ لَکُمْ مِنَ النَّاصِحِیْنَ'' جس وقت حضرت موسیٰ، خدا سے کار تبلیغ کی سنگینی کا تذکرہ کررہے تھے تو یہ سنگینی صرف اس لئے نہیں تھی کہ انہیں ظالم و جابر فرعون سے گفتگو کرنی تھی۔ نہیں، یہاں دوسرے قسم کی سنگینی مراد ہے۔

خدایا مجھے ایسا موسیٰ بننے میں مدد کر جس میں موسیٰ موجود نہ ہو جس میں ''میں'' ''انا'' اور ''خود'' موجود نہ ہو منیت، انانیت اور خودی سے پاک موسیٰ بنادے۔ تاکہ پورے خلوص سے تیرا پیغام عوام تک پہنچا سکوں۔

تکلّف سے پرہیز:

تبلیغ کی دوسری شرط ''تکلف'' سے پرہیز ہے۔ خداوند عالم پیغمبر اکرمؐ کو خطاب کرکے ارشاد فرماتا ہے ''قُلْ مَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ''۔ ص/۸۶۔ اے پیغمبرؐ کہہ دیجئے کہ میں اپنی تبلیغ کا کوئی اجر نہیں چاہتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والا غلط بیان ہوں۔ تکلف کیا ہے؟ مفسرین نے اپنے اپنے انداز میں اس کی تفسیر بیان کی ہے اور شاید سب کی بازگشت ایک ہی مطلب کی طرف ہو۔ تکلف یعنی خود کو مشکل میں ڈالنا ''اپنے سے منسوب کر لینا''، ممکن ہے انسان کسی چیز کا خود قائل نہ ہو اور عامۃ الناس کو اس کا معتقد بنانا چاہتا ہو۔ اس سے بڑا کوئی درد نہیں ہے کہ انسان خود جس چیز پر عقیدہ نہ رکھتا ہو دوسروں کو اس کا معتقد بنانے کے لئے کوشاں ہو۔

ابن مسعود اور دوسرے مفسرین نے ''تکلف'' کے معنی کے سلسلہ میں کہا ہے: ''قَوْلٌ بِغَیْرِ عِلْمٍ'' یعنی امامؑ اور پیغمبرؐ کو چھوڑ کر دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا شخص نہ ملے گا جسے تمام سوالوں کا جواب معلوم ہو اور اس سے ہر سوال کیا جاسکتا ہو۔ دنیا میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ مجھ سے دین کا جو سوال چاہے پوچھ لو مجھے ہر سوال کا جواب معلوم ہے۔

لیکن پیغمبرؐ یہ دعویٰ کرسکتے ہیں حضرت علیؑ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں ''سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ'' پیغمبرؐ اور ائمہؑ کے سو کسی اور سے یہ توقع بے جا ہے۔ للٰہذا ہمیں اپنی حد پہچان کر اسی حد میں رہنا چاہئے۔ ممکن ہے ہمیں فلاں دینی مسئلہ معلوم ہے اسی کی تبلیغ کریں گے اسی کو لوگوں تک پہنچائیں گے لیکن جس مسئلہ کو ہم نہیں جانتے پھر بھی زبردستی لوگوں کے سامنے اس کے بارے میں اظہار رائے کرنے پر اڑے ہوئے ہیں جس چیز سے ہم خود واقف نہیں ہیں اسے کیسے دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں؟

ابن مسعود کہتے ہیں: ''قُلْ مَاتَعْلَمْ وَلاَ تَقُلْ مَا لاَ

تَعْلَمْ'' جو جانتے ہو اسی کے بارے میں زبان کھولو اور جو کچھ نہیں جانتے اس کے متعلق مت بولو۔ اگر تم سے اس کے متعلق سوال بھی کریں تو مردانگی کے ساتھ کہہ دو مجھے نہیں معلوم اس کے بعد وہ یہ آیت پڑھتے تھے: ''مَااَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَ مَااَنَامِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ''

بقدر علم بلندی:

ابن جوزی مشہور ومعروف خطیب ہیں ایک دن وہ ایک منبر پر تقریر کر رہے تھے جس میں تین زینے تھے۔ مجمع میں ایک عورت نے کھڑے ہو کر ان سے ایک مسئلہ دریافت کر لیا۔ انھوں نے کہا مجھے نہیں معلوم ہے۔ عورت نے کہا اگر تم مسئلہ نہیں جانتے تو پھر دوسروں سے تین زینہ اوپر کیوں بیٹھے ہوئے ہو۔ انھوں نے کہا یہ تین زینہ اتنا ہی اونچا ہے جتنا میں جانتا ہوں اور تم لوگوں کو نہیں معلوم ہے۔ میں اپنے علم کے بقدر اونچے مقام پر بیٹھا ہوں۔ اگر میں اپنی جہالت ومجہولات کے لحاظ سے اوپر بیٹھتا تو فلک الافلاک جتنا اونچا منبر بنانا پڑتا۔ جن چیزوں سے میں نابلد ہوں اگر ان کے لحاظ سے اونچے مقام پر بیٹھتا تو میرا منبر آسمان کو چھو رہا ہوتا۔ جب انسان کسی چیز کو نہیں جانتا تو یہ اعتراف کر لینے میں کیا قباحت ہے کہ میں نہیں جانتا اس میں کیا برائی ہے؟

میں نہیں جانتا:

شیخ انصاری شوشتر کے رہنے والے تھے۔ علم وتقویٰ میں بے مثال تھے۔ آج بھی علماء وفقہاء ان کی کتابوں کی علمی گتھیاں سلجھانے اور ان کے لکھے ہوئے علمی نکات سمجھنے پر فخر کرتے ہیں۔ جب کبھی ان سے کوئی سوال کرتا تھا اور انہیں اس کا جواب معلوم نہ ہوتا تھا یا کچھ تردد ہوتا تھا تو بلند آواز سے فرماتے تھے مجھے نہیں معلوم ہے۔ بلند آواز سے اس لئے کہتے تھے تا کہ شاگرد بھی سن لیں، سیکھ لیں کہ اگر انہیں کسی سوال کا جواب نہیں معلوم ہے تو صاف صاف کہہ دیں کہ میں نہیں جانتا۔

ایک سال ماہ رمضان میں اپنے دوستوں کے ہمراہ نجف آباد گیا ہوا تھا۔ سڑک عبور کرتے وقت بیچ راستہ میں ایک دیہاتی نے مجھے پکڑ کر کہا جناب میرے ایک مسئلہ کا جواب دیجئے۔ میں نے کہا فرمائیے کیا مسئلہ ہے۔ اس نے کہا: غسل جنابت کا تعلق جسم سے ہے یا روح سے میں نے جواب دیا: آپ کی بات میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔ غسل جنابت بھی تمام غسلوں کی طرح ایک غسل ہے۔ ایک لحاظ سے اس کا تعلق روح سے ہے کیونکہ اس میں نیت ضروری ہے اور ایک لحاظ سے جسم سے مربوط ہے کیونکہ انسان اپنے بدن کو دھوتا ہے کیا آپ یہی جاننا چاہتے تھے؟

اس دیہاتی نے کہا: آپ صحیح جواب دیجئے۔ میں نے کہا میں اس سے زیادہ نہیں جانتا اس نے کہا اگر آپ نہیں جانتے تو پھر عمامہ کیوں پہن رکھا ہے۔

!!!

اسلام میں آغاز جہاد اور اسکا پس منظر

عماد العلماء علامہ ڈاکٹر سید علی محمد نقوی صاحب مدظلہ

جنگ ایک ایسا لفظ ہے جسے سنتے ہی انسان لرز جاتا ہے جنگ ایک ایسی بھٹی ہے جو ہمیشہ نوجوانوں کے گرم خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے جو ہمیشہ ان کے حسین وسبک جذبات سے کھیلا کرتی ہے یہ ایک ایسی حسینہ ہے جسکے جسم پر صرف انسانی خون کا لباس کھلتا ہے۔ جو صرف ایک ہلکی سی جنبش چشم سے پورے پورے شہر غارت کر سکتی ہے۔ جو کبھی فرعون کا روپ دھارن کر کے معصوم خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے، کبھی یزید کا بھیس بنا کر حسینیت کے خون سے ہولی کھیلتی ہے کبھی چنگیز اور ہلاکو بن کر ایشیا و یورپ کو روند ڈالتی ہے۔ کبھی ہٹلر کی شکل میں کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ یہ ایسی ایک ایسی ندی ہے جو جب باڑھ پر آتی ہے تو نہ ماؤں کی سلگتی مامتا کا خیال کرتی ہے اور نہ بچوں کی معصوم محبت کا جو اس کی زد میں آتا ہے اسے ڈبوتی چلی جاتی ہے، دنیا کی ہر چیز بزبان بے زبانی جنگ کی تباہ کاریوں کا فسانہ سناتی ہے مگر یہی جنگ کبھی کبھی اتنی پاکیزہ چیز بن جاتی ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قومیں اس پر ناز کرتی ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب جنگ عظیم و بلند اصولوں کی حفاظت کی خاطر لڑی جائے جب جبر و استبداد کے سر بہ سما سمان محلوں کے ڈھانے کی خاطر لڑی جائے جب آزادئ خیال کے برقرار رکھنے کے لئے لڑی جائے جب آزادئ تحریر و تقریر کی حفاظت کے لئے لڑی جائے، جب مظلوموں کی آواز استغاثہ پر لبیک کہتے ہوئے لڑی جائے اور جب ظالموں کے مجرمانہ ارادوں کے شیش محلوں کو مسمار کرنے کے لئے لڑی جائے، دنیا کے ہر حقیقت پسند مذہب اور حق گو قوم نے ایسی جنگوں کو سراہا ہے ایسے ہی بلند مقاصد کی خاطر جو جنگیں لڑی جائیں شرع اسلامی میں انہیں جہاد کہتے ہیں۔

پیغمبر اسلام جس دور میں مبعوث بہ رسالت ہوئے وہ عربوں کے لئے انتہائی تاریکی کا دور تھا۔ انکی خون آشامی اور جہالت کا یہ عالم تھا کہ بات بات پر پورے قبیلہ تہس نہس کر دئے جاتے تھے۔ دو قبیلوں کے افراد کے درمیان معمولی جھگڑے سالہا سال اور پشتہا پشت چلا کرتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عرب میں اس وقت انسانی خون سے زیادہ کوئی چیز سستی نہیں تھی۔ اور شمشیر زنی اور نیزہ افگنی سے زیادہ کوئی فن قابل اعتناء نہیں سمجھا جاتا تھا شائد اس وقت عربوں کے سامنے اگر کوئی اصول تھا تو بس یہ کہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس''

اس پس منظر میں ہماری کوتاہ عقل تو یہی کہتی ہے کہ جو پیغمبرؐ آتا اس کو انہیں فنون میں مہارت حاصل کرنا چاہئے تھی اور پھر کوئی طاقتور لشکر جمع کر کے اپنے ان ہم وطنوں کو مرعوب کرنا چاہئے تھا اور پھر لاٹھی کے زور پر اپنے مذہب اور اپنے اصولوں کو

تسلیم کروانا چاہئے تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو فرعونیت اور حقانیت میں فرق کیا رہ جاتا۔

اسلام کا مقصد نہ کسی سلطنت کا قیام تھا اور نہ لاٹھی کے زور پر اپنے اصولوں کو منوانا! اسلام کا بانی خوب سمجھتا تھا کہ طاقت کا جادو سر چڑھ کر ضرور بولتا ہے، مگر دل فتح کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے پہلے:۔

انسانی ذہن سے جہالت کی تاریکیوں کو دور کرنا ہوگا اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب علم، سورج بن کر ان کے دماغوں میں چمکنے لگے۔ اس لئے اسکی زبان پر پہلا پیغام آیا وہ تھا ''اِقرَأ'' پڑھو، سمجھو، سیکھو۔ اس نے دوسری منزل معرفت الٰہی کو بنایا کیونکہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچاننے میں عربوں کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ انکی جہالت و تنگ نظری اور ہٹ دھرمی ہی تھی۔ اس نے پیغام دیا۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ اور اپنے مقصد سے دنیا کو روشناس کروانے کے بعد اس نے اپنے کو متعارف کروایا کہ۔ ''محمد رسول اللہ''۔

ظاہر ہے کہ اس قوم کے لئے جس کا تکیہ بچھونا ہی خونریزی بنی ہوئی ہو، اس شریفانہ پیام میں کہاں تک جذب ہوسکتا ہے جس میں دشنہ و خنجر کا ذکر ہے اور نہ شمشیر و سنان کا۔ ان کی سطحی نظروں میں تو یہ ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس ہوگا جس سے انکا فطری جوش طبیعت مجروح ہوتا ہوگا۔ لیکن دنیا میں راکھ کے ڈھیر میں بعض چنگاریاں بھی پنہاں ہوتی ہیں ان عرب جاہلوں میں بعض ذہین بھی تھے، ان میں سے بعض نے تو اس پیغام کی روح کو سمجھ لیا اور ابو طالب، علیؑ، زید بن حارثہ یا خدیجہ اور فاطمہ بنت اسد بن کر پیغمبر کی آواز پر لبیک کہی، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو اس تہہ دار پیام کے دور رس اثرات کو بھانپ تو ضرور گئے مگر اسے تسلیم کرنے میں انکو اپنا اقتدار متزلزل نظر آیا کرسی، سرافرازی اپنے نیچے سے سرکتی محسوس ہوئی، اور انہیں اپنے بنائے ہوئے ظلم و ستم کے اونچے محل گرتے نظر آئے اس لئے وہ اپنے دماغ کی حقیقت شناسی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس پیغام کی ہر طرح سے مخالفت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور ابولہب، ابوجہل و ابوسفیان بن کر تاریخ انسانی کے ذرین صفحات کو اپنے کرتوتوں سے سیاہ کر ڈالا۔ باقی رہے عوام تو وہ تو جہالت کی آہنی زنجیروں میں جکڑے تھے ہی وہ آنکھ بند کر کے تشدد کے انہیں راستوں پر گامزن ہو گئے جو ایک مدت سے انکے جولانگہ حیات بنے ہوئے تھے اور علم و حکمت کے پیغمبر کو ہر طرح سے تکلیف و آزار دینے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

اب پیغمبر اسلامؐ کو طرح طرح کے مصائب کا شکار ہونا پڑا رسولؐ جس گلی سے گذرتے قریش کے بچے ان پر پتھر برساتے اور انکی شان میں طرح طرح کی گستاخیاں کرتے لیکن حضرت کیلئے اس جسمانی اذیت سے زیادہ وہ روحانی اذیت تھی جو اس وقت ہوتی ہوگی جب وہ نگاہ تصور سے دیکھتے ہوں گے کہ ان کے اصحاب کو عرب کی چلچلاتی دھوپ میں لٹا کر ان پر گرم تار کول ڈالا جا رہا ہے ذہن رکتے رکتے کتاب واقعات کے اوراق

پلٹتا ہوگا۔ اور غریب الوطن حبشی بلال اور صہیب رومی کو پہونچنے والی ایذائیں انکے دل سے لہو ٹپکاتی ہوں گی جنکا ذہن اب جہالت سے بالکل پاک ہو چکا تھا اور جنھوں نے تشدد کے خلاف سینہ سپر ہونے کا عہد کر لیا تھا اور انکی زبان پر اب بھی وہی پیغام تھا جو انکے آقا نے دیا تھا۔ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ''

کبھی رسول کی تخیل میں عصمت و شرافت کی وہ دیوی جگمگانے لگتی ہوگی جس کا نام زنیرہ تھا۔ جو حالانکہ ایک کنیز تھی مگر روشن دل و دماغ رکھتی تھی، اور کسب نور کی صلاحیت رکھتی تھی اس جرم میں ابو جہل نے اس کی آنکھیں نکلوائی تھیں، کبھی رسولؐ کے سامنے وہ صفحہ آجاتا ہوگا جب حباب ابن الارت کو دہکتے انگاروں پر لٹایا گیا تھا یہاں تک کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی جناب دہکتے انگاروں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈے ہو گئے۔ مگر وہ ایک دنیا کے دلوں کو گرما گئے ایک جہاں کو درس حق دے گئے۔

یہ ایسی روحانی اذیتیں تھیں جن پر کوئی بڑے سے بڑا اور صابر سے صابر انسان مشتعل ہو سکتا تھا مگر یہ امن و سلامتی کا پیغمبرؐ اور انسانیت کا حقیقی نمائندہ تھا یہیں پر مصائب ختم نہیں ہو گئے بلکہ اس کے بعد رسول اور انکے ساتھیوں کو تین سال شعب ابی طالب میں محصور رکھا گیا تمام ناکوں پر پہرے بٹھا دئے گئے اور اعلان عام کروا دیا گیا کہ پیغمبرؐ تک آب و غذا کا مختصر ترین حصہ بھی نہ پہونچ سکے، بڑے بڑے لشکر ایسے موقعوں پر ہتھیار ڈال دیتے ہیں مگر رسولؐ کے لئے یہ کہاں ممکن تھا کہ وہ ظلم و ستم کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے اور کوئی ہوتا تو جاں جاتے دیکھ کر تشدد پر آمادہ ہو جاتا، مارنے مرنے پر تیار ہو جاتا مگر رسولؐ کے سامنے اب بھی انسانیت کے مقدس اصول تھے، وہ اب بھی ڈنکے کی چوٹ پر یہی کہہ رہے تھے کہ:

''لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ''

اگر اس موقع پر رسولؐ جنگ کی ابتدا کر بھی دیتے تب بھی تاریخ آپ کا نام ہمیشہ جذبۂ احترام کے ساتھ لیتی، کیونکہ اس وقت وہ سب وجوہ موجود تھے جن کی وجہ سے ایک جنگ مقدس ہوتی ہے، اہل قریش مسلمانوں کی آزادئ خیال پر پابندیاں لگا رہے تھے، ظلم و استبداد اپنی انتہائی بلندی پر پہونچ چکا تھا، گمراہوں کے غلط ارادے اپنے انتہائی عروج پر تھے، مگر رسولؐ نے اس وجہ جواز سے انسانیت کی خاطر فائدہ نہیں اٹھایا اور اب بھی اپنی بات پر جمے رہے کہ ''الصلح خیر'' صلح و صفائی اچھی چیز ہے ابن آدم کے خون بہانے سے کوئی فائدہ نہیں، انسان عالم وجود کا بہترین فن پارہ ہے۔ اس کے مٹانے سے کوئی مقصد حل نہیں ہو سکتا مگر شاید مشرکین اس کا غلط مفہوم سمجھے انہوں نے اندازہ لگایا کہ شاید پیغمبر اسلام ہماری طاقت سے خوفزدہ ہیں، اس لئے سخت سے سخت مصائب آپ کی ذات پر ڈھانا شروع کر دئے اور بالآخر آپ کے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔ اب رسولؐ کو اپنی ذات کے ساتھ انسانیت خطرے میں محسوس ہوئی اس لئے پیغمبرؐ بادل ناخواستہ، اپنے بستر پر اپنے چچا زاد بھائی اور اپنے سب سے بڑے جان نثار علی ابن ابی طالبؑ کو

چھوڑ کر رات کی تاریکی میں مشرکین کی چشم شمشیر سے بچ کر مدینے کی طرف ہجرت کر گئے۔

پیغمبرؐ اسلام کی اس پر امن فتح پر، مشرکین بہت چراغ پا ہوئے اور اب وہ مدینے پر حملے کی تیاریاں کرنے لگے دوسری طرف پیغمبرؐ جب مدینے پہونچے تو وہاں نیر اسلام کی بدولت پہلے ہی تاریکیاں چھٹ چکی تھیں پیغمبر کے پیغام کو سب نے خلوص دل کے ساتھ قبول کیا کیونکہ اسمیں انکو اپنا ہی فائدہ نظر آیا۔ پیغمبرؐ نے مدینہ آکر پہلا کام یہ کیا کہ شہر کے دو زبردست قبیلوں اوس وخزرج میں صلح کروا دی یہ ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے اس طرح یثرب کے اوپر جو خون آشام گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں وہ اس پیغمبر تعمیر واصلاح کے صدقہ میں چھٹ گئیں اس کے بعد پیغمبرؐ نے اہل یثرب کی خوشحالی کی مہم شروع کر دی مشرکین کی زیادتیوں کی وجہ سے جو لوگ اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر مدینہ میں مارے مارے پھر رہے تھے ان کی بحالی کی گئی جو غریب و ناچار مدینے میں موجود تھے جن کو نہ کھانے کے لئے روٹی دستیاب تھی اور نہ بیٹھنے کے لئے کوئی معقول جگہ ان کے لئے ایک چبوترا بنوایا گیا جس پر بیٹھنے والے اصحاب صفہ کہلاتے تھے۔ اور جن کو دونوں وقت کا کھانا سرکار رسالت کے یہاں سے ملتا تھا۔ پیغمبرؐ نے مسلمانوں میں ایک برادری کا تصور قائم کیا۔ اور اسی زمانے میں مواخات کا واقعہ ظہور پذیر ہوا جس میں انصار و مہاجرین کو گلے ملایا گیا مدینے میں اس روز افزوں ترقی سے مدینے کے آس پاس رہنے والے یہودی قبائل خوفزدہ ہوئے۔ اس لئے انہوں نے پیغمبرؐ کی طرف ناجنگ معاہدہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور رسولؐ نے اپنے اسی اصول کی بنا پر کہ جہاں تک ممکن ہو انسانی خون نہ بہنا چاہیئے، ان سے معاہدہ کر لیا جس کے رو سے ان کے درمیان طے ہو گیا کہ یہ ایک دوسرے سے کبھی جنگ نہیں کریں گے اور اگر کوئی مسلمانوں پر حملہ آور ہوگا تو یہودی الگ تھلگ رہیں گے اور اگر کوئی ان پر حملہ کرے گا تو مسلمان غیر جانبدار رہیں گے گویا رسولؐ نے اس کے ذریعہ ایک دفاعی معاہدہ کر لیا اگر رسولؐ چاہتے تو یہ شرط بھی رکھ سکتے تھے، کہ اگر ہم کسی پر حملہ کریں تو تم ہمارے ساتھ رہنا، مگر ایسی صورت میں یہ ایک حملہ آورانہ معاہدہ بن جاتا اور اس سے رسولؐ کے مقصد کو ٹھیس پہونچتی۔

پیغمبر اسلامؐ کی یہ ایک سال کی مصروفیتیں، اس انسان کے لئے بڑی اہم ہیں جسے رائے زنی کرنی ہو کہ پیغمبرؐ جنگ کے متعلق کیا نظریات رکھتے تھے۔ اگر پیغمبرؐ جنگ پسند ہوتے تو وہ، ان تعمیری کاموں کے بجائے یہی وقت ساز و سامان جنگ کی تیاریوں میں صرف کرتے، مسجدوں کے بنوانے کے بجائے مضبوط قلعے تعمیر کرواتے، اصحاب صفّہ پر جو کچھ صرف کرتے تھے اسے فوجیوں پر صرف کرتے، اور اس کے بعد کمزور یہودیوں پر حملہ فرما کر اور ان کے قلعوں پر قبضہ کر کے اپنے اثرات میں اضافہ فرما لیتے۔ مگر یہ تاریخ عالم کا بدیہی فیصلہ ہے کہ پیغمبرؐ نے ایسا کچھ نہ کیا، دنیا کی سب

تاریخیں یک زبان ہیں کہ پیغمبرؐ نے نہ فصیلیں تعمیر کروائیں نہ قلعے بنوائے، نہ فوجوں کو بھرتی کیا، نہ اسلحہ خریدے بلکہ اس کے بجائے کنویں کھدوائے، مسجدیں تعمیر کروائیں، مہاجرین کی آبادکاری کی، یہودیوں سے سمجھوتہ کیا اور ایسے ایسے تعمیری کام کئے جن کے لئے برسوں درکار تھے۔ اب ایک حقیقت پسند دماغ کے لئے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے کہ رسولؐ جنگ پسند نہ تھے بلکہ رزم آرائیوں کو غلط اور انسانیت کے حق میں مضر خیال کرتے تھے۔ اس لئے انسان پر یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اسی سال کے آخر میں پیغمبرؐ نے جو پہلی جنگ کی وہ ان سے کی گئی، یا انہوں نے کی۔ مگر افسوس ہے کہ اموی دور کے بعض مورخوں نے یہ حکایت وضع کر لی، کہ رسولؐ کی طرف سے اشتعال انگیزی کی گئی تھی اور بدر کی جنگ جو تاریخ اسلامی کا پہلا جہاد ہے، پیغمبرؐ کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی، اور یہ کہ (معاذ اللہ) رسولؐ اپنے ساتھیوں کو لیکر مدینے سے نکلے کہ ابوسفیان کے قافلہ کو لوٹیں اور اس کی اطلاع سالار قافلہ کو ہوگئی جس نے اس کی اطلاع مکہ دیدی جہاں سے ابو جہل کی قیادت میں ایک ہزار کی فوج قافلہ کی حفاظت کے لئے روانہ کی گئی ادھر پیغمبرؐ کی قیادت میں مسلمان قافلہ کو لوٹنے نکلے تھے، مگر قافلہ تو دوسری راہ سے نکل گیا اور ان مسلمانوں کی قریش کے لشکر سے ٹکر ہوگئی۔

اگر تھوڑی بہت عقل سے بھی کوئی شخص کام لے تو اس حکایت کو ہرگز تسلیم نہیں کرسکتا۔

اشتعال انگیزی کا جہاں تک سوال ہے، کوئی بھی صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ وہ انسان جس نے اپنے قریب رہنے والے کمزور یہودی قبائل کے خلاف کوئی اشتعالی کاروائی نہیں کی وہ دور دراز دیس میں بسنے والے مشرکین کو کیوں مشتعل کرے گا۔ اور پھر طرہ یہ کہ انکی طاقت کو بھی اچھی طرح جانتے ہوئے اور اپنی قوت کا بھی پورا اندازہ رکھتے ہوئے اس سے (معاذ اللہ) ایسی احمقانہ حرکت کی امید کون کرسکتا ہے اور اگر یہ سب کرنا ہی ہوتا تو وہ ایک سال تک مدینے میں یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھا رہتا۔

جہاں تک اس حکایت کا تعلق ہے کہ رسولؐ نے قافلہ لوٹنے کے لئے مدینہ چھوڑا تھا اور ان کی لاعلمی کے عالم میں فوج سے ٹکر ہوگئی، تو یہ بھی عقلی اور قرآنی دلائل کے رو سے غلط ثابت ہوجاتا ہے۔

میدان تحقیق کے کسی بھی راہی کو اس منزل باطل تک رسائی حاصل کرنے میں جو پہلی خلیج نظر آئے گی وہ یہ کہ کیا یہ ممکن بھی ہے، کہ اتنا بڑا لشکر اتنی جلدی مسلح ہوکر مسلمانوں کے مقابلہ میں پہونچ جائے۔ یہ جس زمانے کی بات ہے اس میں عربوں میں کوئی بادشاہیت قائم نہیں تھی مختلف الخیال قبائل کی حکومت تھی، پھر ظاہر ہے کہ کسی ایسے لشکر کا سوال ہی نہیں جس کو خزانہ شاہی سے تنخواہ ملتی ہو، بلکہ جب کوئی ہنگامی موقع آتا تو خود عرب عوام ہی سپاہی بن کر میدان جنگ میں پہونچ جاتے تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ عام لوگوں کے لئے سفر کی

دشواریوں کے ساتھ گھر کو اتنی آسانی سے چھوڑ دینا بھی آسان نہیں تھا، اس لئے انسان ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ عربوں کو ذہنی طور سے اس کے لئے ایک مدت سے تیار کیا جا رہا تھا۔ اور ان کو اسلام کے خلاف کاروائی کرنے کے لئے اسلحہ سے ہر طرح لیس کر دیا گیا تھا۔

باطل کے موقف تک رسائی حاصل کرنے میں جو دوسری مضبوط رکاوٹ نظر آئے گی وہ قرآن کی وہ آیتیں ہیں جن میں بدعقیدہ مسلمانوں کی قبل وقوع واقعہ دہشت و پریشانی کی تصویر کشی کی گئی ہے اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اتفاقی طور پر کسی لشکر سے نہیں ٹکرا گئے تھے بلکہ ان کے رہنما نے پہلے ہی سے اس لشکر کے آنے کی اطلاع دے دی تھی، جو مسلمانوں کو تباہ کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ان قرآنی آیتوں کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اسلام کی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے یہ الزام انہیں لوگوں کا عائد کردہ ہے جو، قرآن کو خدا کا کلام سمجھتے ہیں بلکہ ''حَسبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ'' کے قائل ہیں۔

قرآن اس منظر کا نقشہ اس طرح کھینچ رہا ہے۔

''مسلمانوں کا ایک گروہ ناگواری محسوس کر رہا تھا، اور وہ آپ کے بارے میں جھگڑے کر رہے تھے بعد اس کے کہ ان پر وہ (حق) ظاہر ہو چکا تھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ موت کی طرف کھینچ کر لے جائے جا رہے ہیں جب کہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اور جب اللہ نے اطلاع دی تھی کہ دونوں گروہوں (تجارتی قافلہ اور لشکر) میں سے کسی ایک سے تمہاری مڈبھیڑ ہوگی، اور تم آرزومند تھے کہ وہ جو قوت و طاقت نہیں رکھتا تمہارے مقابلہ میں آئے، اور اللہ چاہتا تھا کہ حق کو قائم کرے اور کافروں کا قلعہ قمع کرے۔''

اس بیان سے بہت سے حقائق پر سے پردہ سرکتا ہے اس میں ہے کہ '' جب اللہ نے اطلاع دی کہ دونوں گروہوں میں سے ایک سے تمہاری مڈبھیڑ ہوگی'' یہ اطلاع مسلمانوں کو اس وقت دی گئی جب وہ میدان کے لئے رخت سفر باندھ رہے تھے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پہلے مشرکین کی فوج مکہ سے چل دی پھر اس کے بعد اس فوج کے دفعیہ کے لئے پیغمبرؐ نے اپنے ساتھیوں کو مدینہ چھوڑنے کا حکم دیا۔ ایسا نہیں ہوا کہ رسول قافلہ پر حملہ کرنے نکلے ہوں اور پھر رسولؐ کی زد سے قافلہ کو محفوظ رکھنے کے لئے فوج بھیجی گئی ہو۔ اس بیان میں مسلمانوں کے خوف و اضطراب کی منظر کشی کی گئی ہے اگر واقعی یہ ایک نہتے قافلے کو لوٹنے نکلے ہوتے تو اس اضطراب کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ در اصل ایک لشکر قاہرہ کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے تھے اور اسی سے سمجھ رہے تھے کہ ہم موت کے منھ میں ڈھکیلے جا رہے ہیں۔ اب ان عقلی اور قرآنی ثبوتوں سے یہ بات تو پائے تکمیل تک پہونچ گئی کہ لوٹ مار کی حکایت من گڑھت ہے اور حقیقت سے اسکا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ در اصل مشرکین نے مدینہ پر چڑھائی کی تھی، تا کہ رسول، ان کے جان نثاروں اور انکے مشن کو خاک میں ملائیں۔ اگر اس کے بعد بھی پیغمبر ہاتھ

پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تو اس سے نہ صرف دین اسلام تباہ ہو جاتا بلکہ یہ پوری انسانیت کی تباہی کی تمہید بن جاتا اگر مشرکین بغیر کسی رکاوٹ کے مدینے تک آجاتے تو وہ یقیناً شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادیتے اور رسولؐ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ایک مہمان کی خاطر، میزبانوں کو، نہ صرف، اپنے جان و مال سے، بلکہ اپنی عزتوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑے اس لئے رسولؐ، بادل ناخواستہ، اپنی جماعت کو لیکر، دفاع کے لئے شہر سے نکلے۔ اور اس طرح مذہب اسلام میں پہلا جہاد رونما ہوا۔

اس موقع پر قرآن کی جو آیت جواز جہاد کا پروانہ لیکر اتری وہ بھی بڑی حد تک اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے جس کو اس مضمون میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

''اجازت دی جاتی ہے (دفاع کی) ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جارہی ہے اس بنا پر کہ ان پر مظالم ہوئے ہیں اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے وہ جن کو نکالا گیا ہے ان کے گھروں سے بغیر کسی خطا کے، سوا اس کے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا مالک اللہ ہے''

اس ارشاد الٰہی کا پہلا جز دنیا کے لئے قابل غور ہے اس سے یہ بات روز روشن کی طرح کھل جاتی ہے کہ جنگ بدر تک اسلام نے مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت نہیں دی تھی اور اب وہ راز بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ مشرکین سے اتنے عظیم خطرے کے باوجود، پیغمبرؐ نے ایک سال تک دفاع یا بہ الفاظ دیگر جنگ کی تیاری کیوں نہیں کی۔ قدرت کی اس واضح شہادت کے بعد یہ بات بھی پایۂ ثبوت تک پہونچ جاتی ہے کہ اشتعال انگیزی رسولؐ کی طرف سے نہیں ہوئی تھی بلکہ دشمنان اسلام نے ظلم وستم اور زیادتیوں سے کام لیا تھا اور مسلمانوں کو ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا تھا۔

اسی آیت کے آخری جز میں خود لسان قدرت نے مسلمانوں کو اذن جہاد دینے کا پس منظر اس طرح بیان کیا ہے۔

''اور اگر نہ ہوتا دفعہ کرنا اللہ کا بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے تو گرجے گرا دئے جاتے، اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہیں اور مسجدیں، جن میں اللہ کا ذکر بہت ہوتا ہے۔''

گویا مسلمانوں کو جہاد کی اجازت اس لئے دی جارہی تھی کہ ظالموں کی ہمتوں پر اوس پڑجائے، ان کے باطل ارادے خاک میں مل جائیں اور ان کا دست طمع اور آگے نہ بڑھ سکے۔

قرآن نے گرجوں، اور دوسرے مذاہب کے معبدوں کا تذکرہ کرکے اس حقیقت کی طرف اشارہ کردیا۔ کہ یہ اذن جہاد نہ صرف مسلمانوں کے حق میں ہے بلکہ تمام عالم انسانیت کی بھلائی کی خاطر ہے۔

اس کے بعد تاریخ اسلام کا پہلا جہاد رونما ہوا۔ جب مشرکین چڑھائی کرتے ہوئے یثرب کے قریب چاہ بدر تک آگئے اور مٹھی بھر مسلمانوں نے بڑھ کر، ظاہری اسباب کے تقاضے کے بالکل برخلاف، اس لشکر جرار کے پرخچے اڑا دئے اور نہ صرف ابوجہل کا خاتمہ کیا، بلکہ اس کے ناپاک منصوبے کی پوری عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

شخصیت امام حسنؑ علمی پیمانہ پر

مترجم:-مولانا سید مجتبیٰ قاسم رضوی صاحب

اگر وہ دور اندیش عقل جو انسانی زندگی کے لئے ہر جگہ کارآمد ثابت ہوتی ہے اور اس کو اسلامی شخصیات کا بنیادی رکن تسلیم کیا جاتا ہے اور اگر رسول اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ بھی براہ راست اسی الٰہی تربیت کے مکمل شاہکار تھے کہ جن کا انبیاء کرام کے علاوہ کوئی بھی مثل نہیں تھا اور علمی میدان میں کسی کو بھی اس حد تک دسترسی نہیں تھی یہ اس بات پر دلیل ہے کہ امامؑ اپنے علم کو براہ راست یا پیغمبرؐ سے حاصل کرتا ہے یا پیغمبرؐ کے جانشین امامؑ سے اور امامؑ کی وسعت فکری اور روحانی بلندی ایسی ہے کہ نئے نئے حوادث میں امامؑ کو پختہ ارادہ کا مالک بنا دیتی ہے اس بات نے متکلمین کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا ہے کہ وہ امامؑ کے علم کو علم حضوری سے تعبیر کریں کیونکہ امامؑ ایسے موقعوں پر کسی مسئلے میں غور کرنے یا کسی سے سیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اسے براہ راست ایک طرح کا الہام حاصل ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ الہام اور وحی میں فرق ہوتا ہے۔

ہر وہ انسان جو ایک منصفانہ طبیعت کا مالک ہے وہ ائمہ معصومینؑ کی کتاب زندگی کا مطالعہ کر کے یہ بات محسوس کرسکتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کسی بھی علمی مسئلے کو حل کرنے میں دھوکہ نہیں کھایا اور کسی بھی سوال کے جواب میں خاموش نہیں رہے اور کسی بھی بیان وتفسیر میں چاہے وہ فکری ہو یا علمی، نہیں جھجکے۔

یہاں ہم علم امام حسنؑ کے جوش مارتے ہوئے چشمے کی چند مثالیں ذکر کرتے ہیں:

۱۔حسن بصری نے جب امام حسنؑ سے قضاء وقدر کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے اس کے خط کے جواب اس طرح سے تحریر فرمایا:-

اَمَّا بَعْدُ فَمَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِالْقَدْرِ خَيْرَهٖ وَشَرَّهٖ، اِنَّ اللهَ يَعْلَمُهٗ فَقَدْ كَفَرَ، وَمَنْ اَحَالَ الْمَعَاصِيَ عَلَى اللهِ فَقَدْ فَجَرَ ......اِلٰى آخِرِهٖ

اگر کوئی انسان اس چیز پر ایمان نہ رکھتا ہو کہ تمام اچھائیاں اور برائیاں قدر الٰہی کی بناء پر ہیں اور خداوند کریم انسان کے تمام افعال سے آگاہ ہے تو وہ کافر ہے اور جو بھی اپنے گناہوں کو خداوند کریم کی طرف نسبت دیتا ہے وہ فاجر ہے اس لئے کہ خداوند کریم کسی کو اپنی اطاعت یا نافرمانی پر مجبور نہیں کرتا اور انسان کو اس کے حال پر بھی نہیں چھوڑ دیتا ہے بلکہ جو اختیارات اس نے اپنے بندوں کو دے رکھے ہیں وہ ان تمام

اختیارات کا مالک ہے اور جن چیزوں پر انسان قدرت رکھتا ہے خداوند کریم ان کا قادر حقیقی ہے وہ اپنے بندوں کو خود مختار رکھ دینے کے بعد بھی ان پر حاکم ہے اور وہ بندوں کو حکم دیتا ہے جبکہ اس نے انہیں آزاد رکھ دیا ہے اور برے کام سے روکتا ہے جبکہ اس کی نہی عقاب کا پہلو بھی رکھتی ہے اگر انسان اپنے آپ کو خدا کی اطاعت کے حوالے کر دے تو خداوند کریم اس کو تمام چیزوں سے بے نیاز اور بے خوف بنا دیتا ہے اور اگر اس نے خدا کی بارگاہ میں معصیت کی اور اس کی اطاعت سے روگردانی اور سرکشی کی تب بھی خدا اس پر احسان کر کے اسے روکتا ہے اور خداوند کریم کبھی بھی اپنے بندوں کو گناہ کے انجام دینے پر مجبور نہیں کرتا ہے اس نے لوگوں پر احسان کیا اور انہیں دانا اور بینا بنا کر بھیجا ہے اور ان کو ہمیشہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کیا ہے کوئی بھی بندہ مجبور نہیں ہے کہ خداوند کریم کی اطاعت کرے اور اس طرح فرشتوں کی طرح منزہ ہو جائے اور نہ ہی خداوند کریم نے کسی کو فعل حرام کی انجام دہی سے روکا ہے خداوند کریم کے پاس روشن دلائل ہیں اگر وہ چاہے تو تم سب کی ہدایت کر سکتا ہے۔

امام حسنؑ مختصر الفاظ میں فکری مباحث کے پیچیدہ اور عمیق مسائل کو اس طرح حل کر دیتے تھے وہ مسائل جن کی ظرافت کی بنا پر بہت سے مفکرین گمراہ ہو گئے اور ان کی غیر متوازی تفسیر کی بنا پر دو گروہ وجود میں آ گئے ایک معتزلہ، دوسرا اشاعرہ۔

یہیں سے امامؑ کے دقیق افکار اور دقت نظر کی نشاندہی ہو جاتی ہے امامؑ سے سوال کیا گیا زہد کسے کہتے ہیں؟

آپؑ نے فرمایا: دنیا سے بے توجہی اور پرہیز گاری کی طرف مائل ہونا۔

آپؑ سے پوچھا گیا: حلم کسے کہتے ہیں؟

آپؑ نے فرمایا: اپنے غصے کو پی کر اپنے او پر قابو پانا۔

آپؑ سے پوچھا گیا: میانہ روئی، خوش روئی کسے کہتے ہیں؟

آپؑ نے فرمایا: برائی کا نیکی سے جواب دینا۔

پھر آپؑ سے سوال کیا گیا شرف کسے کہتے ہیں؟

آپؑ نے جواب دیا: اپنے قرابتداروں سے نیکی کرنا اور ان کی کوتاہیوں کو خندہ دلی سے نظر انداز کر دینا۔

آپؑ سے پوچھا گیا: دلیری کسے کہتے ہیں؟

آپؑ نے جواب دیا اپنے ہمسایہ اور پڑوسی کا دفاع کرنا اور غصہ اور سختی کے وقت صبر کر لینا اور بے جھجک مشکل کاموں میں ہاتھ ڈال دینا۔

پھر آپؑ سے سوال کیا گیا: مجد و بزرگی کس چیز میں ہے؟

آپؑ نے جواب دیا: فقیری اور غریبی کی حالت میں خدا کی راہ میں خیرات کرتے رہنے اور دوسروں کی غلطیوں سے چشم پوشی کر لینے میں۔

پھر آپؑ سے سوال کیا گیا مروّت کس میں ہے؟

آپؑ نے جواب دیا اپنے دین اور عزت نفس کو محفوظ رکھنا اور دوسروں سے ملاقات کے وقت نرمی سے ملنا اور دوسروں کے حقوق کو ادا کرتے رہنا اور لوگوں سے دوستی رکھنا۔

ایک شامی نے امام حسنؑ سے سوال کیا حق و باطل کے

درمیان کتنا فاصلہ ہے آپؑ نے فرمایا :اَرْبَعَةُ اَصَابِعٍ فَمَا رَأَیْتَ بِعَیْنِکَ فَهُوَ الْحَقُّ ،چار انگل کا فاصلہ ہے جو آنکھوں سے دیکھا ہے وہ سچ ہے جبکہ کانوں سے سنی ہوئی اکثر باتیں جھوٹی ہوتی ہیں ۔شامی نے سوال کیا :ایمان ویقین کے درمیان کتنا فاصلہ ہے ؟تو آپ نے فرمایا :اَرْبَعَةُ اَصَابِعِ الْاِیْمَانِ مَا سَمِعْنَاهُ وَ الْیَقِیْنُ مَا رَأَیْنَاهُ ،چار انگل کا فاصلہ ہے جس کو ہم سنتے ہیں وہ ایمان ہے اور جو دیکھتے ہیں وہ یقین ہے ۔شامی نے سوال کیا: آسمان وزمین کے درمیان کتنا فاصلہ ہے تو آپؑ نے فرمایادَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ ،مظلوم کی آواز کے بقدر جو مدد طلب کرتی ہے ،شامی نے سوال کیا مشرق ومغرب کے درمیان کتنا فاصلہ ہے تو آپؑ نے فرمایا: مَسِیْرَةُ یَوْمٍ لِلشَّمْسِ اتنا ہی فاصلہ ہے کہ سورج جس کو ایک دن میں طے کرلیتا ہے۔

وہ فکری میراث جو آپؑ سے ہم تک پہونچی ہے

حضرت کا یہ ارشاد ہے :اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّهُ مَنْ نَصَحَ لِلّٰهِ وَ اَخَذَ قَوْلَهُ دَلِیْلاً هُدِیَ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ ......اِلٰی آخِرِہٖ

اے لوگو جو بھی خدائے تبارک وتعالی کی خاطر لوگوں کو نصیحت کرتا ہے اور اپنی بات کی دلیل خدا کے کلام کو قرار دیتا ہے وہ براہ راست ہدایت پاتا ہے اور خداوند کریم اس کو کمال کامیابی عطا کرتا ہے اور بہت ہی خوش اسلوبی سے اس کی راہنمائی کرتا ہے اس لئے کہ خداوند کریم کے زیر عنایت رہنے والا ہمیشہ محفوظ رہتا ہے اور اس کا دشمن خوفزدہ رہتا ہے اور ذلیل ہوتا ہے خداوند کریم کے بے شمار ذکر کے ذریعہ سے اس کے غضب سے محفوظ رہو ،تقویٰ کے ذریعہ سے خدا سے ڈرتے رہو اور اطاعت کے ذریعہ سے اس سے نزدیک رہو اس لئے کہ وہی اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ کا مصداق ہے اور خداوند کریم فرماتا ہے وَ اِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ (سورۂ بقرہ آیت ۱۸۶) جب بھی میرے بندے میرے بارے میں تم سے پوچھیں تو ان سے کہدو کہ میں ان سے نزدیک ہوں اور کوئی مجھ سے سوال کرتا ہے تو اس کا جواب بھی دیتا ہوں پس میری دعوت کو قبول کرلو اور مجھ پر ایمان لے آؤ شاید اس طرح سے ہدایت پا جاؤ پس خداوند کریم پر ایمان لے آؤ اس لئے کہ جو خداوند کریم کی بزرگی کا قائل ہو جاتا اس کے لئے خود تکبر زیب نہیں دیتا جو لوگ خدا کی عظمت و بزرگی کے قائل ہیں وہ متواضع اور فروتن ہوتے ہیں اور جو خداوند عالم کے جلال کو درک کرلیتا ہے ان کی بزرگی اپنے آپ کو ناچیز شمار کرنے میں اور جن لوگوں نے خدا کی قدرت کو دریافت کرلیا ہے ان کی عظمت خدا کے سامنے تسلیم ہو جانے میں ہے اتنی معرفت حاصل کرنے کے بعد لوگوں کو انکار نہ کرنا چاہیے اور ہدایت کے بعد گمراہ نہیں ہونا چاہیے اے لوگو پرہیز گاری کو تم نہیں پہچان سکتے جب تک صفت ہدایت کو نہ پہچان لو اور کتاب الٰہی سے عہد نہیں کرسکتے جب تک اس سے منھ موڑنے والے کو نہ پہچان لو اور قرآن کو اس وقت تک صحیح نہیں پڑھ سکتے جب تک کہ اس میں تحریف کرنے والے کو پہچان نہ لو۔

جب بھی تم ان مطالب کو سمجھ لو اور بدعتوں کو اور تحریف کو پہچان لوگے اور خداوند کریم کے بارے میں تہمت لگانے والے اور کلمات الٰہی میں تحریف کرنے والے کو پہچان لوگے تو یہ بھی پہچان لوگے کہ کس طرح سے ایک گروہ نے اپنے خواہشات نفسانی سے یہ سب کیا ہے دیکھو جاہل تمہیں اپنے جہل کی طرف نہ کھینچ لیں ان چیزوں کو ان کے اہل لوگوں سے حاصل کرو چونکہ ان کے پاس ایک خاص نور ہوتا ہے کہ ان سے روشنی حاصل کرنا چاہیئے اور وہ لوگ امام ہیں، انہیں کی اقتدا کرنی چاہیئے اس لئے کہ علم کی زندگی اور جاہلوں کی موت انہیں کی وجہ سے ہے یہ وہ لوگ ہیں جو تمہیں جاہلوں کی نشاندہی کرواتے ہیں اور ان کی رفتار و گفتار ان کی حقانیت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور ان کا ظاہر ان کے باطن کا شفاف آئینہ ہوتا ہے یہ حق سے مخالفت نہیں کرتے ہیں اور حق کے بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف نہیں کرتے ان کے لئے سنت الٰہی معیار زندگی ہوتی ہے اور خداوند کریم انہیں کی اتباع و پیروی کا حکم دیتا ہے یہ باتیں اہل ہوش کی صرف یاد آوری کے لئے ہیں اس کے بارے میں سوچو اور تنہا ان کے بارے میں سننے پر اکتفاء نہ کرو اس لئے کہ کتاب کے نقل کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں لیکن حقیقت کی تلاش والے کم ہیں۔

ایک دن کسی نے امام حسن مجتبیٰؑ سے سیاست کے بارے میں دریافت کیا تو آپؑ نے فرمایا: هِیَ اَنْ تَرْعَیٰ حُقُوْقَ اللّٰهِ وَ حُقُوْقَ الْاَحْیَاءِ وَ حُقُوْقَ الْاَمْوَاتِ، فَاَمَّا حُقُوْقُ اللّٰهِ فَاَدَاءُ مَاطَلَبَ، وَ الْاِجْتِنَابُ عَمَّا نَهیٰ، وَ اَمَّا حُقُوْقُ الْاَحْیَاءِ فَهِیَ اَنْ تَقُوْمَ بِوَاجِبِکَ نَحْوَ اِخْوَانِکَ وَ لَا تَتَاخَرْ عَنْ خِدْمَةِ اُمَّتِکَ وَ اَنْ تُخْلِصَ لِوَلِیِّ الْاَمْرِ مَا اَخْلَصَ لِاُمَّتِهٖ وَ اَنْ تَرْفَعَ عَقِیْرَتَکَ فِیْ وَجْهِهٖ اِذَا مَا حَادَ عَنِ الطَّرِیْقِ السَّوِیِّ، اَمَّا حُقُوْقُ الْاَمْوَاتِ فَهِیَ اَنْ تُذْکِرَ خَیْرَاتِهِمْ وَ تَتَغَاضَیٰ عَنْ مُسَاوِئِهِمْ فَاِنَّ لَهُمْ رَبًّا یُحَاسِبُهُمْ۔

سیاست یعنی خداوند کریم کے حقوق نیز زندہ اور مردہ افراد کے حقوق کی رعایت کرنا خدا کے حقوق کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کا اس نے حکم دیا ہے اس کو انجام دینا اور جس چیز سے روکا ہے اس سے اجتناب کرنا، زندہ لوگوں کے حقوق یہ ہیں کہ اخلاص رکھنا اپنے برادر دینی کے سلسلہ میں اپنے فرائض انجام دینا اور ان کی بے درنگ و بے دریغ خدمت کرنا اور ولی امر سے اخلاص رکھنا جب تک وہ لوگوں سے اخلاص رکھتا ہے لیکن جب راہ راست سے منحرف ہو جائے تو ان کے مقابل رہنا اور اس پر اعتراض کرنا اور مردوں کے حقوق یہ ہیں کہ مرنے والے کی نیکیوں کو بیان کرنا اور لغزشوں اور گناہوں سے چشم پوشی کرنا اور خود کو روکنا اس لئے کہ خدا ان کے اعمال کا حساب و کتاب کرتا ہے۔

یہ ایک جائزہ ہے امام حسنؑ کی معرفت اور کمال عقل کا جو خداوند کریم نے ان کو عطا کیا تھا یہ علمی و تربیتی میراث ان کے آباء و اجداد سے انہیں ملی تھی اس کے ہم نے چند نمونہ پیش کئے تا کہ ہماری آنے والی مسلمان نسلوں کے لئے شمع حیات کا کام کر سکے۔

(از حیات معصومینؑ ۴مطبوعہ سازمان فرہنگ وارتباطات اسلامی)

امام جعفر صادقؑ
اسلامی امت کے منارۂ فکر

آیت اللہ شیخ جوادی آملی مدظلہ

ترجمہ: مولانا سید احتشام عباس زیدی صاحب

امام صادق علیہ السلام امامت وولایت عامہ کی فضیلت کے علاوہ دوسرے خصوصیات کے حامل بھی ہیں اور ائمہ اطہارؑ کے مانند آپؑ کا نام نامی بھی حضرت حق کے اسماء حسنہ کا مظہر ہے۔ حضرت جو صادق کے لقب سے ملقب ہوئے ہیں بنی نوع انسان کو صداقت کے حصول کی دعوت دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''بات کرنے سے پہلے صداقت وسچائی کے آداب سیکھو'' اگر کلام وگفتگو نظری امور سے متعلق ہو تو حق کہو اور اگر عملی امور سے مربوط ہو تو عمل میں سچے رہو۔ جب تک انسان خود صداقت کی میزان نہ بن جائے سچائی سے آگاہ نہیں ہے۔ اور اگر وہ سچائی سے آگاہ نہیں ہے تو کلام یا گفتگو کا معیار نہیں سمجھ سکتا۔ نہ وہ صحیح طور سے بات کر سکتا ہے اور نہ اہل کلام کی گفتگو کا معیار سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ کلام کا معیار صداقت ہے اور سچائی انسان کے خمیر میں شامل ہے۔ جب تک روح صادق نہ ہو انسان کبھی کلام وگفتگو کا معیار حاصل نہیں کر سکتا۔

یہ صداقت وہی حق ہے اور حق کی تشخیص کا واحد محور عقل ہے۔ حضرتؑ نے ہم کو صداقت کے محور کی تعیین یعنی عقل کی طرف دعوت دی ہے اور فرمایا ہے: ''انسانی زندگی کی اساس وبنیاد فکر وعقل ہے''۔ اگر نظری مسائل میں کہا گیا ہے کہ ''اے انسان تو وہی فکر وعقل ہے'' تو عملی مسائل میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ ''اے انسان تو دراصل وہی ارادہ ونیت ہے۔''

ایک انسان کو بخوبی غور وفکر کرنا چاہیے اور اپنی ان سمجھی ہوئی باتوں پر بخوبی عمل کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ششمؑ فکر کی بنیاد کو بھی عقل کہتے ہیں اور عمل کی بنیاد کو بھی کیونکہ عقل ہی کے ذریعہ ''یُعۡبَدُ الرَّحۡمٰنَ وَیُکۡتَسِبُ الۡجِنَانَ'' رحمان کی عبادت کی جاتی اور جنت ہاتھ آتی ہے۔ یہ ائمہؑ اسلامی امت کی منفصل عقل ہیں جیسا کہ ہم زیارات جامعہ میں ان حضراتؑ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں ''بِکُمۡ یُعۡبَدُ الرَّحۡمٰنُ'' اگر ہر انسان کی عقل اس کی عبادت کا معیار ہے تو ائمہ معصومینؑ امت اسلامی کی عقل ہیں اور اگر اسلامی امت کو عبادت کی توفیق حاصل ہے تو یہ ائمہؑ سے ارتباط کا نتیجہ ہے (بِھِمۡ یُعۡبَدُ الرَّحۡمٰنُ) تا کہ انسان نظری یا نظریاتی پہلو سے بھی قوی وتوانا عاقل ہو اور عملی منزل میں قوی ارادہ کا مالک ہو۔ انسان دو ہم آہنگ حقیقتوں یعنی جسم وروح کا مرکب نہیں ہے اس کی حقیقت ایک ہی ہے جس کی اصل روح اور فرع جسم

انسانی ہے۔حضرت نے فرمایا: ''اگر روح نے کوئی فیصلہ کرلیا تو جسم اس کے اظہار میں کمزوری نہیں دکھاتا''، ممکن نہیں ہے کہ روح تو قوی ارادہ کی مالک ہو لیکن جسم معطل و بیکار رہے۔اگر جسم نے کمزوری ظاہر کی تو یہ روح کے ارادہ کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ایسا نہیں ہے کہ جسم، ارادہ کے سلسلہ میں روح کے برابر اہم ومؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ہماری درخشاں روایات میں سے ہے کہ حضرت نے فرمایا: ''اگر ایک قوم کا ارادہ مستحکم ہو تو اس قوم کا جسم ہرگز کمزوری کا اظہار نہیں کرتا''۔اگر ایک ملت کی روح قوی ہو جائے تو جسم بیکار یا کمزور نہیں رہتا۔اگر امیر کلام یعنی حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ارشاد میں ہمیں ملتا ہے کہ ''نفس مرضیہ،قوت ارادہ کی بنیا پر ہے۔'' یا اگر حضرتؑ فرماتے ہیں کہ ''میں نے باب خیبر کو اپنے جسم کی قوت کے ذریعہ نہیں اکھاڑا بلکہ ارادہ کی قوت سے اکھاڑا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ارادہ قوی ہو تو جسم بھی قوی ہو جا تا ہے۔روح کی طاقت ہے جو جسم کو بھی طاقتور بنا دیتی ہے، کیونکہ روح کی کمزوری ہی بدن میں ظاہر ہوتی ہے۔امام صادق علیہ السلام کا یہ ارشاد ہر انسان کو ارادہ میں قوت پیدا کر نے کے لیے یہ حکم دیتا ہے کہ انسان خدا کے سوا کسی اور چیز کے بارے میں فکر نہ کرے۔جو شخص مادی مسائل میں قوی ہے، وہ ارادہ کی کمزوری اور جسم کی ناتوانی کا شکار ہوتا ہے اور جو شخص گناہ کے سلسلہ میں قوی ہے وہ اسیر ہے اور اسیر انسان ذلیل ہوتا ہے۔جو شخص ظلم وستم کرتا ہے، چاہے خود پر ظلم کرے یا غیر پر، ذلیل وخوار ہے اور ذلیل وخوار انسان قوت ارادہ سے محروم رہتا ہے۔امام صادقؑ نے فرمایا: ''ستم گر ذلیل وخوار ہے۔'' ذلت ظلم میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور عزت اطاعت میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ جو شخص اپنے غرائز کو رام نہیں کر سکتا، ذلیل انسان ہے اور جو اپنی خواہشات پر قابو نہیں پا سکتا وہ بھی ذلیل ہے، کیونکہ سوائے ذلیل وخوار انسان کے کوئی شخص ظلم برداشت نہیں کرے گا۔حضرت امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ: ''ذلیل وفرومایہ انسان کے علاوہ کوئی شخص ظلم برداشت نہیں کرتا۔'' اگر ستم کرتا ہے تو ذلیل ہے اور اگر ستم برداشت کرتا ہے تو بھی ذلیل ہے۔ارادہ کی قوت انسان کو عدالت وانصاف کی طرف بلاتی ہے کہ نہ وہ خود جارح ہو اور نہ جارحیت برداشت کرے۔اور اگر انسان حق کی قدرت پر بھروسہ کرتے ہر ستم سے ٹکرا سکتا ہے تو ارادہ کی وسعت سے مدد کیوں نہیں لیتا اور بلند ہو کر ظالم کے دست ظلم کو قطع کیوں نہیں کر ڈالتا؟ امام ششمؑ نے فرمایا: مظلوم کی آہ اور ستم زدہ کی دعا فلک سوز ہوتی ہے۔ یہ کلمہ طیبہ ہے اور امام صادقؑ قرآن کی وضاحت کرنے والے فرماتے ہیں: ''ستم زدہ شخص کی دعا آسمان تک پہونچتی ہے۔'' اس آسمان سے مراد یہ بلند وبالا فضا نہیں ہے بلکہ وہ آسمان ہے جہاں ہمارا رزق موجود ہے وہ آسمان جس کے در مومنین پر کھلے ہوئے ہیں اور کفار پر ہرگز کھولے نہیں جاتے ۔وہ آسمان جس پر خدا کے خاص فرشتے مامور ہیں۔ جو آسمانی وحی کو حاصل کرنے والے ہیں، یہی وہ آسمان ہے جہاں ستم زدہ افراد کی دعا صعود کرکے پہونچتی ہے۔اگر کوئی شخص یہ جان لے کہ اس کی دعا آسمانوں میں در آتی ہے تو نہ وہ ہرگز ستم برداشت

کر سکتا ہے نہ ظلم کرنے پر آمادہ ہوگا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی تعلیم ہمیں امام صادقؑ نے دی ہے اور ارادہ (یعنی حقیقت عقل) میں قوت پیدا کرنے کا ذریعہ عبادت کو قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ''ارادہ میں قوت وطاقت پیدا کرنے کی واحد راہ عبادت ہے۔''

عبادت کے علاوہ نیت وارادہ کو قوی بنانے کی کوئی اور راہ نہیں ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا ''خدا سے اس طرح ڈرو گویا خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔'' اگر یہ کہا گیا ہے کہ ''اَلْاِنْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ... '' تو یہ ان ہی ارشادات کا پرتو ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں کہ خدا سے یوں ڈرو گویا اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم خدا کو نہیں دیکھتے، وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اگر تم یہ سوچتے ہو کہ خدا تمہیں نہیں دیکھتا تو یہ ایک کفر آمیز خیال ہے۔ اور اگر تم جانتے ہو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے، اس کے باوجود تباہی وفساد کی طرف مائل ہوتے ہو تو گویا تم نے خدا کو پست ترین دیکھنے والا سمجھا ہے کیونکہ دوسرے دیکھنے والوں کے سامنے تو تم گناہ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے لیکن خدا کے سامنے گناہ انجام دیتے ہو؟

خود امامؑ نے ''اِنَّہٗ یَرَاکَ'' (وہ تمہیں دیکھتا ہے) کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے شاگردوں سے فرمایا ''کَاَنَّکَ تَرَاہُ'' جس طرح تم اسے دیکھ رہے ہو۔ لہٰذا خدا سے ڈرو۔ یہ جہنم کا خوف نہیں ہے اور نہ یہ نفس کا خوف ہے بلکہ یہ عقلی خوف ہے۔ امام کے دل میں بھی خوف خدا اس قدر ہے گویا وہ خدا کو دیکھ رہے ہیں۔ امام، امت کیلئے اسوہ ونمونہ ہیں۔ خدا کو دیکھتے ہیں اور خوفزدہ ہیں اور امت گویا خدا کو دیکھتی ہے اور خوف زدہ نہیں ہوتی۔

امام ششمؑ نے ہمیں اس بلند مقام کی تعلیم دی ہے۔ جب ابن ابی العوجاء نے مناظرہ کے وقت امام سے عرض کیا کہ آپ ہمیں غائب کا حوالہ دیتے ہیں؟ اور ہمیں ایک غائب امر کی طرف دعوت دیتے ہیں؟ ہم جب تک کسی چیز کو دیکھ نہیں لیتے اور محسوس نہیں کر لیتے اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن ابی العوجاء کا نظریہ مادی تھا اور وہ حس کی حقیقت کا طرفدار تھا۔ حضرت نے جواب میں اس سے فرمایا: میں تمہیں ایک شاہد وحاضر کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ خدا غائب نہیں ہے، وہ تو تمہارے ساتھ ہے۔ کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے اور تم ہر حالت میں خدا کے روبرو ہو۔

خالق اور مخلوق

یہ اسی شخص کا کلام ہے جو خدا کو اپنی روح کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے ظاہری آنکھوں سے نہیں۔ امام صادقؑ جو اس مقام سے ومنزلت سے ہمکنار ہوئے ہیں حضرت امیر المومنینؑ کے مانند ہیں جو خود فرماتے ہیں اور جمال الٰہی کا نظارہ کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس دیدار کی دعوت دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ: ''تم اس مقام تک پہونچ سکتے ہو گویا خدا کو دیکھ رہے ہو اور یہ منزلت ومقام صرف اور صرف عبادت کے ذریعہ میسر ہوسکتا ہے۔'' جو لوگ امامؑ کے لیے حد امکان سے بلند مقام کے قائل تھے، ائمہ معصومینؑ ان کی اس فکر کو غلط قرار دیتے تھے۔ ایک شخص جو امام صادقؑ کا مرتبہ حد

امکان سے بڑھ کر خیال کرتا تھا، جب حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے وضو کیلئے پانی منگوایا۔ وضو کیا اور عبادت میں مشغول ہوئے۔عبادت سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے فرمایا ''کسی بھی پایہ پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ مت ڈالو، ہم موجود اور مخلوق ہیں۔مخلوق پر خالق کا بلند مقام ومرتبہ بار نہ کرو کیونکہ مخلوق میں اس کے تحمل کی طاقت نہیں ہے۔ یہ مرتبہ ہمارا نہیں ہے، ہم کو بندہ کی حد سے بلند نہ کرو اور حدود امکان سے آگے نہ بڑھاؤ۔''

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ ائمہ معصومینؑ بندگان خدا اور مخلوق خدا ہیں اور عبادت کے ذریعہ اس عظیم اور بلند درجہ تک پہونچے ہیں، تو اب ہم دیکھیں کہ اس اوج وکمال پر امام صادقؑ کیا فرماتے ہیں صارع ابن ابی حفصہ کا بیان ہے کہ امام محمد باقرؑ کی شہادت ورحلت کے بعد حضرت امام صادقؑ کی خدمت میں تعزیت ادا کرنے کے لئے حاضر ہوا۔امام کے پاس پہونچ کر میں نے کلمہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ زبان پر جاری کیا اور عرض کیا کہ امام باقرؑ کی رحلت نے ایک ایسا خلاء پیدا کر دیا ہے جسے پر نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ ایسی شخصیت تھے جو ''قال رسول اللہ'' کہتے تھے اور کسی میں امام سے یہ پوچھنے کی جرأت نہیں تھی کہ آپ نے تو پیغمبر اکرمؐ کو دیکھا نہیں پھر آپ قال رسول اللہ کیسے کہتے ہیں؟ پھر آپؑ اور پیغمبرؐ کے درمیان کافی فاصلہ تھا، آپؑ رسول خدا کی حیات طیبہ کے دوران دنیا میں نہیں تھے پھر آپؑ کیسے پیغمبرؐ سے براہ راست حدیث نقل کر رہے ہیں جبکہ آپؑ نے انہیں نہیں دیکھا؟ ہم ایک ایسے امام سے محروم ہوئے ہیں۔

''صارع ابن ابی حفصہ'' کہتے ہیں جب میری بات تمام ہوئی تو میں نے دیکھا کہ امام صادقؑ نے ایک لمحہ سکوت فرمایا اسکے بعد سر کو بلند کیا اور فرمایا ''خدا فرماتا ہے اکثر تم میں سے کوئی شخص آدھے خرمے کے برابر صدقہ دیتا ہے اور میں اس آدھے خرمہ کو پروان چڑھا کر کوہ احد کی مانند کر دیتا ہوں، جیسے تم ایک بکری کے بچے کو پال کر بڑا کرتے ہو۔''

صارع کہتے ہیں: میں تعجب کرنے لگا، آخر یہ کون شخص ہے جو بلا کسی واسطہ کے خدا کا قول نقل کر رہا ہے۔امام باقرؑ بلا واسطہ پیغمبرؐ کا قول نقل فرماتے تھے لیکن امام صادقؑ تو بلا واسطہ خدا کا قول نقل کر رہے ہیں۔ یہ حضرات کون ہیں اور کیا تھے اور آخر کس راہ سے اس کمال کو پہونچے ہیں؟ آخر ایک ملکوتی انسان کس طرح بلا واسطہ خدا کا قول نقل کر رہا ہے؟ اگر چہ وحی تشریحی نبی ورسول سے مخصوص ہے لیکن وحیِ تکمیلی اور وحیِ تائیدی اور وحی کے تمام دیگر سلسلے ولایت کا حصہ ہیں۔ اس باطن میں دوسرے شریک وسہیم ہیں دیگر تمام افراد کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی ولایت کی برکت سے ہے۔امام صادقؑ اس منزل پر ہیں کہ ایک بات براہ راست خدا سے نقل کر رہے ہیں جو شخص خدا کو دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے کلام خدا کو بھی دل کے کانوں سے سنتا ہے۔اگر انسان کامل پہلا صادر ہونے والا یا پہلا ظاہر ہونے والا انسان ہے اور دیگر موجودات بعد میں صادر وظاہر ہوئے ہیں تو جو فیض بھی دیگر موجودات تک پہنچتا ہے اسی انسان کامل کے صدور یا ظہور کی برکت سے ہے۔

خدا سے رابطہ

''صارع ابن ابی حفصہ'' کہتے ہیں، مجھے جو بھی ضرورت پیش آتی امام صادقؑ بلا فاصلہ اس سلسلہ میں خدا کا قول نقل فرما دیتے۔ گویا ہمارے مذہب کا امام و رہبر وہ ہے جو خدا سے براہ راست رابطہ رکھتا ہے۔ اب دیکھئے کہ جو ہمارا رہبر ہے اسلام اور دنیا کے مسلمانوں کا رہبر ہم سے کیا کہتا ہے۔ امام صادقؑ سے ہم تک کچھ فرمائشات پہونچی ہیں جن میں سے کچھ فرمائشیں میں یہاں بیان کرتا ہوں تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ حضرت اسلامی امت کی اصلاح کے سلسلہ میں کس قدر مہربان، کوشاں اور دردمند و خیر خواہ ہیں۔

امام باقرؑ نے امام صادقؑ کے بارے میں فرمایا: ''امام صادقؑ ائمہ معصومینؑ کے علاوہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں سے افضل و برتر ہیں''

امام صادقؑ فرماتے ہیں: ''اپنی رحلت کے وقت پدر بزرگوار امام باقرؑ نے مجھ سے وصیت کی کہ اپنے اصحاب تک خیر پہونچاؤ۔ انہوں نے فرمایا کہ: ہماری امت اور ہمارے دوستداروں تک خیر پہونچاؤ اور انہیں ان کی ضرورتوں کے سلسلہ میں دوسروں سے بے نیاز کر دو۔'' امام صادقؑ فرماتے ہیں: پدر بزرگوار کی وصیت نے مجھ پر اس قدر اثر کیا ہے کہ خدا

کی قسم جہاں تک مجھ سے ہوسکتا ہے اپنی امت کے استقلال اور اسے دوسرے سے مستغنی و بے نیاز بنانے میں کوشاں رہتا ہوں۔''

امام صادقؑ فرماتے ہیں: خدا کی قسم میں اپنی امت کے درمیان کسی کو دوسرے کا محتاج نہ رکھوں گا اور کوشش کروں گا کہ وہ علمی، فکری اور سیاسی مسائل میں خود مستقل ہو، دوسرے کا محتاج نہ رہنے پائے۔'' یہ امام صادقؑ کا ارشاد ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: ''اے لوگوں! اگر تم اپنے معاشرہ کو ہمہ جہت متمدن اور ترقی یافتہ بنانا چاہتے ہو تو تمہارے لیے ان اصولوں کی رعایت ضروری ہے۔ ان میں سے بعض اصول رفاہی مسائل سے مربوط ہیں اور بعض جو اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اعتقادی اور بنیادی و حقیقی تمدنی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ رفاہی مسائل سے مربوط اصول تین ہیں۔ جن کے بغیر انسان کی زندگی خوشگوار نہیں ہوسکتی۔

(۱) صاف اور اچھی ہوا۔ (۲) فراواں پانی۔ (۳) کھیتی اور دوسرے کاموں کے لئے نرم اور آمادہ زمین۔ یعنی کوشش کرو کہ جہاں تم رہتے ہو وہاں کی ہوا صاف و سالم رہے۔ پانی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ اسے اچھی طرح استعمال کرو اور یہ کوشش کہ تمہارے پاس فراواں پانی موجود رہے۔ ایسی سرزمین حاصل کرو جو کھیتی اور باغات کیلئے مناسب ہو۔ یہ باتیں رفاہی مسائل سے مربوط ہیں۔ لیکن جو اصول ایک اسلامی معاشرہ کی اساس و بنیاد ہیں کہ اگر کوئی قوم ان سے عاری ہو تو وہ متمدن اور مہذب ہی نہیں ہے۔ امام صادقؑ کی نگاہ میں یہ تین اصول ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا: تین چیزیں ایسی

ہیں جن سے کوئی انسانی گروہ بے نیاز نہیں ہے۔ اگر ایک قوم فقیہ عادل کی راہنمائی سے محروم ہو۔ اگر ایک ملت طاقتور فوج اور مہربان وخیرخواہ حکام سے محروم ہو اور اگر کوئی قوم قابل اعتماد طبیبوں سے محروم ہو تو وہ سراسر تمدن وسعادت سے محروم ہے۔ سب سے پہلی ضرورت ایک بلند مرتبہ فقیہ کی ضرورت ہے تا کہ وہ دین کے ضروری احکام لوگوں کو تعلیم دے۔ دوسرے خیرخواہ ومہربان فرمانرواو حکام ہیں، تاکہ عوام ان کی اطاعت کریں۔ اور تیسری ضرورت معاشرہ میں بابصیرت، بیدار دل اور پاک طینت اطباء کا وجود ہے۔

یہ ساری چیزیں فراہم کرنے کی تعلیم ہمیں امام صادقؑ نے دی ہے تا کہ لوگ ان اصولوں سے آشنا ہوں۔ اور جب اپنے مخصوص شاگردوں کو دیکھتے تھے تو فرماتے تھے: ''یہ جو میری دینی درسگاہ اور الٰہی دانشگاہ بند کر دی گئی ہے اسکی شکایت وفریاد میں خدا کی بارگاہ میں لے جاؤں گا۔ کاش یہ طاغوت (آپ کے عہد کا ظالم بادشاہ) مجھے مہلت وموقع دیتا تو میں طائف میں (جس کی آب وہوا اچھی ہے) دینی تعلیم کا مرکز قائم کرتا۔ خود طائف جاتا اور تم لوگوں کو طائف آنے کی دعوت دیتا اور وہاں تمہیں اسلامی علوم واصول سے آگاہ کرتا۔'' یہ امام صادقؑ کی خواہش وتمنا ہے۔ اگر کسی کے پاس امکانات موجود ہیں اور وہ جوان ہے تو خود کو بیکار اور کاہل نہ ہونے دے کیونکہ اگر اس میں کاہلی اور جمود پیدا ہو گیا تو گویا امام سے اس کا رابطہ مستحکم نہیں ہے۔

حضرتؑ نے فرمایا: کاش اگر یہ طاغوت مجھے مہلت دیتا کہ میں طائف میں ایک تعلیمی مرکز قائم کرتا وہاں شاگردوں کو تربیت دیتا اور یہ تمام چیزیں اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتا تا کہ وہ ان الٰہی علوم سے آشناہ ہوتے۔ دیکھئے! لوگوں کو آگاہ کرنیکے لئے امام صادقؑ کس قدر کوششیں فرماتے ہیں۔ یہ تمام باتیں امامؑ نے ہم سے اس عنوان سے فرمائیں کہ وہ اپنے شاگردوں کو عالم ملکوت میں عظیم مقام سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: جانتے ہو کون سا گروہ امامت سے ہمکنار ہوسکتا ہے۔ کون سا گروہ وارثین انبیاءؑ کی صف میں آسکتا ہے؟ کون سا گروہ انبیاء کرامؑ کے صالح اخلاف میں شمار ہوسکتا ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اگر چہ زمین پر کمزور ومستضعف ہیں لیکن باطن میں عظیم عالم ہیں۔ امام صادقؑ کے مکتب فکر میں وہی کمزور ومستضعف کامیاب ہوسکتا ہے جو صرف روئے زمین میں مستضعف ہو۔ اگر کوئی شخص روئے زمین پر بھی مستضعف ہو اور عالم ملکوت میں بھی، کامیاب نہیں ہوسکتا۔ وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جو صرف روئے زمین پر کمزور ومستضعف ہو۔ مومن اگر مستضعف ہے تو اس کی یہ کمزوری اور ناتوانی صرف زمین پر ہے لیکن عالم ملکوت میں وہ عزیز وسربلند ہے۔ امام صادقؑ نے اپنے آگاہ ودانا شاگردوں کا تعارف آسمانوں اور عالم ملکوت کے عزیز وسربلند افراد کی حیثیت سے کرایا اور فرمایا: جو شخص خدا کے لئے علم حاصل کرے اور خدا کی رضا کیلئے اپنے علم پر عمل کرے نیز خدا کی رضا کیلئے دوسروں کو اپنے علم سے بہرہ ور کرے وہ باطن میں عالم وسربلند ہے۔ یہ عزیز وسربلند انسان پیغمبر کا

وارث بن سکتا ہے۔

نہ مروانی، نہ عباسی

شیخ کلینیؒ نقل کرتے ہیں کہ جب امام محمد باقرؑ نے اپنے فرزند امام صادقؑ کو دیکھا تو فرمایا: ''یہ میرا وہ فرزند ہے جسے خداوند عالم نے بزرگ و باعظمت قرار دیا ہے''۔ اس قول کی شرح میں یہ کہا گیا ہے کہ جس شخص کی کمزوری وناتوانی فقط زمین تک محدود ہے وہ کامیاب ہے۔ مسلمان اگر کمزور ہے تو اس کی یہ کمزوری فقط روئے زمین تک ہے ورنہ آسمانوں میں اور عالم باطن میں وہ عزیز وسربلند اور گراں قدر حیثیت کا حامل اور کامیاب ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک غیر الٰہی اور بے دین مستضعف کامیابی سے ہمکنار ہوجائے۔ اگر ایک گڑھے سے نجات پایا ہے تو دوسرے گڑھے میں گر جائے گا۔ لیکن امام صادقؑ نے اپنے شاگردوں کو مروانی حکومت کے گڑھے سے نکال کر عباسی حکومت کے گڑھے میں گرنے نہیں دیا۔ فرمایا: ''نہ مروانی اور نہ عباسی، نہ بنی امیہ اور نہ بنی عباس۔'' فقط روئے زمین پر کمزور ومستضعف رہنے والا ہی امام ہوسکتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی تمام نیک اور صالح ذریت امام ہے۔ اگرچہ قرآن کریم میں بعض افراد کو امام کہہ کر پکارا گیا ہے اور بہت سے انبیاؑء کے سلسلہ میں امامت کا ذکر ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ سب ابراہیمی انبیاؑء ہیں اور خدا وند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول کر لی ہے۔ امامت عطا کیا جانے والا منصب ہے حاصل کیا جانے والا نہیں چونکہ یہ عطا کیا جانے والا منصب ہے لہٰذا خداوند عالم نے فرمایا: ''میں نہیں دوں گا۔ ظالم امامت نہیں پائے گا اور میں اسے یہ منصب نہیں دوں گا۔ اگر کوئی حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں ظالم نہ تھا بلکہ سب عادل تھے تو حضرت ابراہیمؑ کی دعا مستجاب ومقبول ہے اور تمام ائمہ وانبیاؑء یہاں تک خاتم اوصیاء تک حضرت ابراہیمؑ کی نیک و صالح ذریت ہیں اور ائمہ وامام ہیں۔ خداوند عالم نے اسی پہلی منزل میں امامت ابراہیمؑ کو ان کی آخری صالح اولاد تک معین ومقرر کر دیا ہے۔

فرمایا: میں نے یہ منصب انہیں عطا کیا ہے۔ یہ روئے زمین پر امام ہیں۔ اس لئے کہ یہ فقط زمین کی حد میں مستضعف اور کمزور ہیں زمان کی حد میں نہیں یہ شارحین اصول کافی کا قول ہے کہ خداوند عالم فقط ان لوگوں کو امامت عطا کرتا ہے جو مسلمان، موحد، پاک باطن اور پاک دل ہوں۔ ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں بخشا۔

آپ نے عباسیوں کی سازش کے بارے میں سنا ہوگا کہ انہوں نے کچھ پیسہ اکٹھا کیا اور اسے خراسان کے شیعوں کے خمس کی رقم کے عنوان سے مدینہ لے آئے تاکہ بنی ہاشم کے درمیان اس رقم کو تقسیم کر کے ان سے اس کی رسید لے لیں، چنانچہ جو شخص اس سازش کا عامل اور مہرہ تھا وہ خراسان (یا کہیں اور سے) وہ رقم لے کر مدینہ آیا اور اس نے کچھ لوگوں کے درمیان وہ رقم تقسیم کر کے اس کی رسید لے لی، پھر امام صادقؑ کی جستجو میں نکلا۔ اس نے دیکھا کہ امامؑ مسجد نبوی

کے اندر نماز میں مشغول ہیں۔ وہ امام صادقؑ کے پیچھے بیٹھ گیا۔ امامؑ نے فوراً اپنی نماز تمام کی اور فرمایا: اس سازش سے ہاتھ اٹھالو۔ یہ بنی ہاشم ابھی مروانیوں کے تسلط سے آزاد ہوئے ہیں۔ اب یہ کہتے ہیں کہ نہ ہمیں مروانی قبول ہے نہ عباسی۔ ہم نے اگر ایک کے ظلم سے نجات حاصل کر لی ہے تو دوسرے کے ظلم سے مقابلہ کریں گے۔ یہ ایک الٰہی مستضعف کا قول ہے۔ مستضعف سوائے خدا کے کسی اور پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اسطرح امام صادقؑ نے اس روز اس سازش کا پردہ چاک کر ڈالا اور کھل کر اس کی مذمت کی۔

امامؑ نے فرمایا: یہ (بنی ہاشم) بے چارے ہیں۔ ان کو فریب نہ دو۔ یہ ابھی ابھی اموی ستمگاروں کے ظلم سے آزاد ہوئے ہیں اب انہیں عباسیوں کے ظلم میں کیوں مبتلا کرتے ہو۔ آپؑ نے فرمایا: ہماری نظر میں نہ بنی امیہ درست ہیں اور نہ بنی عباس ہی اچھے ہیں۔

یہ امام صادقؑ کا مکتب فکر ہے۔ ایسا ہی شخص روئے زمین کا امام ہو سکتا ہے۔ یہی پیغمبرؐ کا وارث ہو سکتا ہے۔ جو شخص بنی امیہ کے پنجہ سے آزاد ہو کر بنی عباس کے دامن میں پناہ حاصل کرے، وہ انبیاءؑ کا وارث نہیں ہے۔ خدا سے اپنا عہد نہیں دیتا۔

جب منصور دوانقی کا خط امام صادقؑ کی خدمت میں پہنچا کہ آپ بھی دوسرے درباری ملاّؤں کی طرح ہمارے دربار میں کیوں نہیں آتے؟ تو امامؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

''نہ میرے پاس دنیا ہے نہ اس کی خواہش کہ اس کے لئے میں تیرے پاس آؤں اور نہ تیرے پاس وہ آخرت ہے جس کے معارف سے آگاہی حاصل کرنے کے اشتیاق میں تیرے یہاں آمد و رفت پیدا کروں۔ مختصر یہ کہ میرے آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' یہ ہے امامؑ کا یقین اور اعتماد سے بھرپور جواب۔ جب آپؑ تکلم پر آتے تو بنی مروان کے لئے بھی یوں ہی صریح اور قاطع اظہار فرماتے تھے۔ اس کے بعد منصور دوانقی نے از راہ مکر و فریب آپ کی خدمت میں لکھا: ''میرے پاس آیئے تاکہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔'' ناصح وہ شخص ہے جو لوگوں کو اللہ کی جانب جذب کرے۔ یہ جذب کرنا اور بلانا، تبلیغ سے الگ ہے، تقریر، تحریر اور درس دینے سے جدا ہے۔ واعظ وہ ہے جسے جذب کرنے کا فن آتا ہے۔ ممکن ہے، کوئی تقریر کرے، کتاب لکھے لیکن جذب و کشش پیدا نہ کر سکے۔ کسی کو جذب کرنا ایک مشکل کام ہے۔ جب تک انسان خود مجذوب نہ ہو خود اس میں وہ جذب و کشش کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ خود الٰہی یا اللہ والا نہ ہو اس کی باتیں دلوں میں کشش پیدا نہیں کر سکتیں۔

یہ جو خداوندعالم نے پیغمبر اکرمؐ کو واعظ کی صفت سے پہچنوایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ خود خدا کی سمت جاتے تھے اور دوسروں کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتے تھے۔ جو خدا کی طرف پیش رفت کا اہل ہوتا اسے اپنے ہمراہ لے جاتے تھے۔ انسان یا خود خدا کی طرف جاتے ہیں یا انہیں لے جایا جاتا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا۔ خدا جب

دوسرے انبیاءؑ کے بارے میں اظہار کرتا ہے تو فرماتا ہے: یہ لوگ آئے، اور خاتم الانبیاءؐ کے سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے: ''میں انہیں لے آیا'' دیگر انبیاءؑ کے لئے (خدا کی طرف) جانے کی بات کہی گئی ہے اور خاتم الانبیاءؐ کو لے جانے کا تذکرہ ہے۔ اگر موسیٰؑ کا ذکر ہے تو ارشاد ہوتا ہے: وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا (جب موسیٰ ہماری میعادگاہ پر آئے) اعراف/۱۴۳ اور جب حضرت ابراہیمؑ کی آفاقی والٰہی سیرت کی بات آتی ہے تو ارشاد ہوتا ہے ''اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ'' میں اپنے پروردگار کی طرف جارہا ہوں (الصافات/۹۹) لیکن جب پیغمبر اکرمؐ کے ملکوتی سفر کا تذکرہ ہوتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے: ''سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی'' یعنی پاک وپاکیزہ ہے وہ خدا جس نے اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی سیر کرائی۔ (بنی اسرائیل/۱) یعنی خدا اپنے بندہ کو جذب وکشش کے ذریعہ لے گیا۔

انبیاءؑ خدا کی جانب جاتے ہیں، اپنی پیروی کرنے والوں کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں۔ جو خدا کی طرف لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے واعظ ہے اور جو ایک گروہ کے ساتھ جانے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ بھی واعظ ہے۔ جو فقط باتیں بناتا ہے، مقرر تو ہے واعظ نہیں ہے کیونکہ وہ صرف باتیں کرتا ہے جذب وکشش نہیں رکھتا۔ آپ نے قرآن میں دیکھا ہوگا کہ خداوند عالم پیغمبرؐ سے متعلق فرماتا ہے ''اٹھو اور لوگوں کو اللہ سے ڈراؤ'' کیا ہر شخص کو یہ فن آتا ہے کہ وہ لوگوں کو خدا سے ڈرائے؟ آپ دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم دینی مدارج میں 'عالم' کو پیغمبر کا وارث بناتا ہے پیغمبر کا سب سے اہم منصب ''انذار'' اور ڈرانا ہے۔ ''اٹھو اور لوگوں کو ڈراؤ'' تاکہ لوگ صرف خدا سے ڈریں اور اگر لوگ خدا سے ڈریں تو کسی اور سے خوفزدہ نہ ہوں گے۔

امام صادقؑ دولت کو ٹھوکر مار کر فرماتے ہیں: ہم نہ بنی مروان کے آگے جھکیں گے نہ بنی عباس کے روبرو سرنگوں ہوں گے۔ لوگوں نے دیکھا کہ یہ دولت سے جذب نہیں ہوتے، مکروفریب کے ذریعہ درباری ملّا بنانے کی دعوت سے بھی جذب نہیں ہوتے تو منصور کے حکم سے امامؑ کے گھر کو آگ لگادی گئی۔ شیخ کلینیؒ نقل کرتے ہیں: دیکھنے والوں نے دیکھا کہ امامؑ نے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر قدم رکھ کر فرمایا: ہم اصل واساس زمین کی اولاد ہیں، ہم ابراہیمؑ کی اولاد ہیں یعنی اے منصور دوانقی اگر تو نمرود کی جگہ پر بیٹھا ہوا ہے، اور ابراہیمؑ نہیں ہیں تو میں ابراہیمؑ کی جگہ ہوں حق یہی ہے کہ ہم آگ پر مسلط ہیں۔ میں اسی ابراہیمؑ کا بیٹا ہوں کیا ابراہیمؑ آگ پر مسلط نہیں ہوئے آج بھی وہی ولایت موجود ہے جو مجھ سے ظاہر ہو رہی ہے، ہم انبیاء کرامؑ کے فرزند ہیں ہماری تربیت ایک ایسے گھر میں ہوئی ہے جس کی اصل واساس ان انبیاء کے ہاتھوں تشکیل پائی ہے۔ یہ ہے مروانیوں اور عباسیوں کی گندی سیاست کے مقابلہ میں امام صادقؑ کا بیباکانہ طرز اور مذکورہ بالا فرمائشات امامؑ کی علمی فرمائشات نیز زہد وتقویٰ سے متعلق دستورات ہیں۔

امام حسن عسکریؑ۔ ہیبت الٰہی کا پرتو

(ماخوذ از: پیغام ثقلین نئی دہلی)

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام ۸ر یا ۱۰ر ربیع الثانی ۲۳۲ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور ۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ کو ۲۸ سال کی مختصر عمر میں، سامّرا میں شہید کردیے گئے۔

آپؑ ۲۰ یا ۲۳ سال اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ رہے، جس میں سے تقریباً ایک سال معتز عباسی کی خلافت کے زمانہ میں گذرا پھر ایک سال مہتدی نے حکومت کی اور اسکے بعد معتمد عباسی کا دور خلافت آیا۔ اس غاصب عباسی حکمراں نے اپنی حکومت کے پانچویں سال اپنے ہواخواہوں کے ذریعہ آپؑ کو زہر دے کر شہید کیا۔

آپؑ کی امامت کا زمانہ ۵ سال آٹھ ماہ ہے اور اس مدت کا بیشتر حصہ آپؑ نے قید خانہ یا نظر بندی میں گذارا ہے۔

مرحوم کلینیؒ نے کافی میں روایت کی ہے کہ جس زمانہ میں صالح بن وصیف حضرت کے زندان کا داروغہ تھا، کچھ عباسی خاندان کے افراد، صالح بن علی اور دوسرے گمراہ اور دشمنانِ دین، صالح بن وصیف کے پاس آئے اور کہا کہ جتنا ممکن ہو حضرت پر سختی کرو اور ایک لحہ کیلئے بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دو۔

صالح بن وصیف نے کہا: اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا کہ دو انتہائی تند خو، بدتمیز اور مردم آزار لوگوں کو آپؑ پر مسلط کردیا تھا کہ وہ آپ کو چین وسکون نہ لینے دیں لیکن وہ لوگ حضرتؑ کے اخلاق و کردار اور عبادت سے متاثر ہو کر پابند صوم وصلوٰۃ ہوگئے ہیں۔!

صالح بن علی نے ان دونوں کو بلوا کر خوب ڈانٹا اور کہا کہ تم لوگ اس شخص سے اچھا سلوک کیوں کرتے ہو؟ آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا کہ ہم ایسے شخص کے بارے میں کیا کہیں جو رات عبادت الٰہی اور اپنے پروردگار سے مناجات میں گذار دیتا ہے، دن میں برابر روزہ رکھتا ہے، ذکرِ خدا کے علاوہ کلام نہیں کرتا اور اپنا وقت فضول چیزوں میں ضائع نہیں کرتا۔ جب ہماری طرف دیکھتا ہے تو اسکی ہیبت سے ہمارے بدن لرزنے لگتے ہیں اور گویا پوری طاقت سلب ہو جاتی ہے۔

جب عبّاسیوں نے یہ سنا تو شرمندہ ہو کر وہاں سے چلے گئے۔

فضائل کی کہانی دشمن کی زبانی:

احمد بن خاقان، امام عسکری علیہ السلام کا مشہور دشمن آپؑ کے بارے میں کہتا ہے کہ میں نے سامرا میں حسن بن علی بن محمدؑ (امام عسکریؑ) سے زیادہ وقار، متانت، پاکدامنی، عفت اور عظمت وبزرگی کا مالک کسی کو نہیں پایا۔ بنی ہاشم، آپؑ کے اہل بیتؑ حتیٰ حاکم وقت آپ کو تمام افراد پر خواہ وہ آپ سے عمر

میں بڑے ہی کیوں نہ ہوں مقدم کرتے تھے۔ اسی طرح فوجی افسران، وزراء، مصنفین اور عام لوگ آپؑ کے خاص احترام کے قائل تھے اور میں نے حکّام، مصنفین، قضاۃ، فقہاء اور عوام میں سے جس سے بھی آپؑ کے بارے میں پوچھا تو محسوس کیا کہ وہ آپؑ کے سلسلہ میں غیر معمولی احترام کا جذبہ رکھتے ہیں اور آپؑ کو مقام و منزلت کے اعتبار سے بلند ترین درجہ اور مقام پر فائز جانتے ہیں۔ خدا کی قسم ان کے کسی دوست یا دشمن سے سوائے ان کی تعریف کے آج تک کچھ نہیں سنا، وہ انہیں عزت واحترام اور سلام و درود کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور یہی نہیں میرے والد عبیداللہ بن خاقان کہا کرتے تھے کہ اگر خلافت بنی عباس کے ہاتھ سے نکل جائے تو سوائے ابن الرضا (امام عسکریؑ) کے اس کا کوئی حقدار نہیں کیونکہ پارسائی، پاکدامنی، پرہیزگاری، جہاد بالنفس، زہد، عبادت، خدا پرستی اور تمام اخلاقِ حمیدہ میں آپؑ کو دوسرے تمام افراد پر برتری حاصل ہے۔

عبادت و پارسائی:

شاکر نامی آپؑ کا خادم آپؑ کے بارے میں کہتا ہے کہ امام عسکریؑ جب راستہ چلتے تھے تو کوچہ و بازار میں چاہے جتنا شور و ہنگامہ ہو رک جاتا تھا۔ انسان تو انسان ہیں جانور تک کنارے ہو کر آپؑ کے لیے راستہ چھوڑ دیتے تھے تاکہ آپؑ اس انبوہ کثیر میں سے آرام سے گذر جائیں۔

حضرتؑ جب محرابِ عبادت میں کھڑے ہوتے تھے تو اپنے سجدے کو اتنا طول دیتے تھے کہ کبھی کبھی میں سوجاتا تھا اور جب آنکھ کھلتی تھی تب بھی آپؑ کو سجدہ میں اپنے خدا سے راز و نیاز کرتا ہوا پاتا تھا۔

نصیحت:

حضرت نے اپنے ایک خط میں ابن بابویہ قمیؒ کو لکھا:

''۔۔۔۔۔۔۔وَعَلَيْکَ بِالصَّبْرِ وَانْتِظَارِ الْفَرَجِ، فَاِنَّ النَّبِیَّ صَلّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ: اَفْضَلُ اَعْمَالِ اُمَّتِیْ اِنْتِظَارُ الْفَرَجِ وَلَاتَزَالُ شِيْعَتُنَا فِیْ حُزْنٍ حَتّٰی يَظْهَرَ وَلَدِیَ الَّذِیْ بَشَّرَبِهِ النَّبِیُّ صَلّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ: يَمْلَأُ الْاَرْضَ قِسْطاً وَعَدْلاً کَمَا مُلِئَتْ ظُلْماً وَجَوْراً''

تمہیں صبر اور فرج (کشادگی) کا انتظار کرنا چاہئے کیونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے میری امّت کا سب سے بہترین عمل انتظارِ فرج ہے۔ اور شیعہ متواتر غم واندوہ کا شکار رہیں گے یہاں تک کہ میرا بیٹا ظہور کرے جس کی بشارت دیتے ہوئے پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: ''وہ زمین کو اسی طرح عدل وانصاف سے بھر دے گا جس طرح ظلم وجور سے بھری ہوگی'' اے میرے شیخ اے ابوالحسن علیؒ، صبر کرو اور ہمارے تمام شیعوں کو صبر کی تاکید کرو کیونکہ زمین خدا کی ملکیت ہے وہ جسے چاہے بخش دے اور عاقبت تو متّقی افراد کے لیے ہی ہے۔

ہم اس واجب الاطاعت امام کے یوم شہادت پر تمام مسلمان، دنیا بھر کے شیعوں خصوصاً آپ کے فرزند گرامی حضرت حجۃ ابن الحسن عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی خدمت میں تعزیت وتسلیت عرض کرتے ہیں اور خدا سے آپؑ کی نیز آپؑ کے فرزند ارجمند کی مخلصانہ پیروی کی نعمت کے خواستگار ہیں۔

ریحانۃ الھند

بہار ربیع

سید المتکلمین ابوالبراعۃ علامہ سید ظفر مہدی نقوی گہرجائسی

سبزہ کو جگا آکر اے فصل گلستانی
ہے خواب میں مدت سے یہ مخمل کاشانی

لا سج کے حسینوں کو یوں صحن گلستاں میں
سر پر کلہ گل ہو بر میں ہو قبا دھانی

خوبان گلستاں ہوں اس شان سے نور افگن
آئینہ میں نہروں کے ہو جلوۂ حیرانی

زلفوں کا بگڑنا بھی اس فصل میں اچھا ہے
گلشن کو سنوارے گی سنبل کی پریشانی

مصراع قدموزوں دکھلا کے ابھاراسکو
مدت سے نہیں سنتے بلبل کی غزلخوانی

خالق کی ثنا کرتا گلشن میں جو ہاتھ آتا
لالہ کی قطاروں سے اک سبحہ مرجانی

ہر رات جمال گل گردوں پہ اثر کرتا
ہر صبح ہوا کرتا شبنم کا لہو پانی

ٹکڑے دل بلبل کے ہر سمت پڑے ہوتے
ہر شاخ لئے ہوتی شمشیر صفا ہانی

بازار حسینوں کا جویائے سحر ہوتا
بو غنچوں میں ہو جاتی اک یوسف زندانی

ہر صبح نسیم آتی پتوں کو ہلا جاتی
شان ابر کی دکھلاتی شبنم کی فراوانی

زخم دل بلبل سے فوارہ خوں چھٹتا
دامان سحر ہوتا گلزار میں افشانی

لے ابر کو ہاتھ آیا وہ تخت سلیمانی
بے پردہ ہوئی بجلی آنکھوں کا ڈھلا پانی

جھونکوں سے ہواؤں کے ہلتا ہے دل بلبل
موسم ہے غضب پیارا گو فصل ہے طوفانی

کشتی دل بلبل ڈوبے نہ تھپیڑوں سے
پھولوں کو تو اچھی ہے شاخوں کی مگس رانی

پتوں نے ہرا آنچل ڈالا ہے رخ گل پر
دامن میں زبرجد کے ہے لعل بدخشانی

میزان محبت میں بلبل نے سوا دیکھی
ناطاقتی دل سے پھولوں کی فراوانی

صورت گر گل ہونا آئین محبت ہے
آنسو ہیں عنادل کے دست و قلم مانی

منہ کھولنا آتا تھا کب صحن گلستاں میں
غنچوں نے سکھائی ہے بلبل کو غزلخوانی

غنچوں کے تبسم سے ہر سمت تجلی ہے
ہر طور شجر پر ہیں سو جلوۂ ربانی

جس طرح سے مکہ میں پیدائش مرسل سے
وہ مرسل زورآور جس کے ید طولیٰ نے
جس ہاتھ کی انگلی نے کاٹا سپر مہ کو
یہ چاند کسی شب تھا یوں محو ثنا خوانی
اک نور کے ٹکڑے ہیں کیونکر نبی و حیدر
دیکھ اے نظر منکر چاند اور بڑھاتا ہے
آتشکدۂ فارس گل ہو گیا پرتو سے
پتھر نے جگہ دل میں دی نقش کف پا کو
لینے کے لئے بوسہ اس کے لب و دنداں کے

طعنہ زن انجم تھا ہر ذرہ نورانی
قرص مہ کامل کو توڑا تھا بہ آسانی
اس ہاتھ میں کیا کرتی شمشیر صفا ہانی
دو ٹکڑوں سے پیدا تھا اک مطلع نورانی مطلع
بتلایا اشارہ سے یہ مطلب روحانی
سیپارہ قرآن میں دوپارۂ نورانی
تاثیر کہاں پہونچی برسا تھا کہاں پانی
عنصر میں صنم کے تھا انداز مسلمانی
گردوں سے اتر آئے سب آیہ قرآنی

قطعہ

سید رئیس حسین نقوی عاصیؔ جائسی

فضا جب اپنے لئے سازگار دیکھیں گے
تو پھر کسی کا نہ ہم انتظار دیکھیں گے
مدد خدا کی، طلب ان کی جب ہوئی عاصیؔ
ضرور اپنے نبیؐ کا مزار دیکھیں گے

قطعہ

اسیفؔ جائسی

کیا کیا نبیؐ کی مدح سے عزت نہیں بڑھی
شہرت بڑھی یہ خواہش شہرت نہیں بڑھی
معراج سے بلندیاں پائی ہیں عرش نے
معراج سے رسولؐ کی عظمت نہیں بڑھی

قطعہ

تنویر مہدی نقوی تنویرؔ نگروری

کیا اس پہ تعجب تجھے معراج ہوئی ہے
ہر ایک فضیلت ترے قدموں سے لگی ہے
تنویرؔ کو اس دولت دنیا کے عوض میں
اے ختم رسل در کی ترے خاک بھلی ہے

قطعہ

قائم مہدی نقوی تذہیبؔ نگروری

محمدؐ مصطفی سا رہنما چھوٹا تو سب چھوٹا
بچا ہی کیا حبیب کبریا چھوٹا تو سب چھوٹا
رہ مرسلؐ سے سیدھا راستہ جاتا ہے جنت کو
خدانخواستہ یہ راستہ چھوٹا تو سب چھوٹا

علامہ سید کلب احمد
ماتی جائسی مرحوم

نعت

اے خلق مجسم ! تری کیا مدح وثنا ہو
حد ہے قدم کفر ہو اور تیری ردا ہو
بن جائے وہی نقش کف پا خط تقدیر
یارب! یہی سجدوں کے مقدر میں لکھا ہو
احکام محمدؐ ہیں سب احکام الٰہی
منشا سب انہی کا ہے قدر ہو کہ قضا ہو
سر حدّ قِدم پر ہیں قَدم، واہ رے حادث
اے اول خلقت! ترا ثانی کوئی کیا ہو
نازاں ہوں کہ ہم پلۂ الیاسؑ و خضرؑ ہوں
میرے بھی اور انکے بھی تمھیں راہ نما ہو
مرنا تری الفت میں حیات ابدی ہے
اے ختم رسلؐ، جان مری تجھ پہ فدا ہو
نعت شہ لولاک میں اے ماتی مداح
اب بلبل سدرہ کی طرح نغمہ سرا ہو
کیوں فکر دعا، کیوں غم تاثیر دعا ہو
دامن ترا مٹھی میں جب اے عقدہ کشا ہو
میں سر بقدم اور وہ قدم عرش بریں پر
سجدہ وہی سجدہ ہے جو یوں پیش خدا ہو
کونین پہ احساں ہے تمھارا شہ لولاک
تم علت ایجاد ہو، تم راز بقا ہو
دیکھ آیۂ ماینطق میں شان محمدؐ
ہے وحی جو لب ہائے مبارک سے ادا ہو
نعلین سمیت آیئے، اے صاحب معراج!
کچھ اور شرف عرش معلیٰ کو عطا ہو
محشر میں فراموش نہ کرنا شہ کونین!
یہ ماتی عاصی بھی وہاں تحت لوا ہو

نعت

مرا دل رہ نوردِ جادۂ مدح پیمبرؐ ہے
وہ منزل ڈھونڈھتا ہے جو حد امکاں سے باہر ہے
کہوں کیونکر کہ اوج آسماں بطحیٰ کا ہمسر ہے
مدینہ سجدہ گاہ آفتاب و ماہ و اختر ہے
حبیبؐ حق تصور میں تری کفش مطہر ہے
دماغ شاعر معجز بیاں عرش بریں پر ہے
خوشامستی کہ ہے کیف مسلسل زندگی میری
مئے عشق نبیؐ ہے اور میرے دل کا ساغر ہے
کہاں امکاں تری توصیف سے عہدہ برآئی کا
ثنائے مختصر یہ ہے کہ تو ممدوح داور ہے
مسلسل اشک جاری ہیں غم عشق پیمبرؐ میں
یہ آنکھیں ہیں مری یا منظر تسنیم و کوثر ہے
کہاں کا وعدۂ فردا، مری جنت ہے دنیا میں
رسولؐ حق کا روضہ، روضۂ رضواں سے بہتر ہے
تجھے اے اوّل مخلوق، حادث کس طرح کہہ دوں
قدم تیرا، شہ کونین سرحد قدم پر ہے
نبیؐ کی مدح میں پہلے ہوئی رطب اللساں قدرت
ہماری مدح اے ماتی مگر قند مکرر ہے

نعت

سید الشعراء سید محمد حسن نقوی سالکؔ

بہار آئے امید دل گل صد رنگ ہو جائے
نہ اتنا بھی کہ دامان تمنا تنگ ہو جائے

دل بلبل سلامت رہ سکے یہ غیر ممکن ہے
چٹکنا جب کلی کا نغمہ و آہنگ ہو جائے

بجائے حسن دل دامان گل پر اے چمن والو!
کہیں ایسا نہ ہو شبنم کا ٹکنا ننگ ہو جائے

ہم آہنگیٔ فطرت پھر زمانے کو سلا دینا
ہماری داستان دل جہاں بے رنگ ہو جائے

بہت بے کیف ہے عالم ذرا نظریں اٹھا ساقی
کھلیں گیسو گھٹاؤں کے سحر شب رنگ ہو جائے

میری دیوانگی سے ہوش والوں سے محبت میں
کہاں تک جنگ جب تحریر قسمت سنگ ہو جائے

اٹھا اب دست زور آور کہ وقت چیرہ دستی ہے
وہ جوہر کیا کسی تلوار میں جو زنگ ہو جائے

ہوں کتنی رنجشیں دل میں زباں شیریں رہے لیکن
نہ کر اپنوں سے ایسی گفتگو جو ننگ ہو جائے

زمانہ جانتا ہوں دشمن اہل مروت ہے
مگر وہ صلح بہتر ہے جو بعد از جنگ ہو جائے

رسالت ہو تو ایسی ہو نبوت ہو تو ایسی ہو
کہ دست پاک میں آئے تو گویا سنگ ہو جائے

قطعہ

رضاؔ جائسی

سب کے سب خاصۂ قیوم نظر آتے ہیں
سبھی قرآن کے مفہوم نظر آتے ہیں
کیوں نہ عصمت کو بھی ہو خانۂ زہراؑ پر ناز
اس میں معصوم ہی معصوم نظر آتے ہیں

مدح نبیؐ

اسیفؔ جائسی

میں حمد خدا، مدح نبیؐ کرتا ہوں
چھوٹا ہوں مگر بات بڑی کرتا ہوں
کرتا ہوں ثنائے آل سردارؐ رسل
جو کرتے تھے سرکار وہی کرتا ہوں

نعت شریف

مولانا شاہ نعیمؔ عطا سلونی مرحوم

اے شاہ رسل، اے فخر امم، سب تم سے ہیں کم تم سب سے سوا
کھاتا ہوں انہیں قدموں کی قسم، سب تم سے ہیں کم تم سب سے سوا
مظہر ہے تمہارا کون و مکاں، روشن ہے تمہیں سے سب یہ جہاں
تم مہر عرب تم ماہ عجم، سب تم سے ہیں کم تم سب سے سوا
پہنچے نہ تمہارے رتبہ کو، دنیا میں نبی ہوتے ہی رہے
الیاس و خضر نوح و آدم، سب تم سے ہیں کم تم سب سے سوا
ہم در پہ تمہارے آئے ہیں، کچھ حاجتیں اپنی لائیں ہیں
ہوجائے ادھر بھی چشم کرم، سب تم سے ہیں کم تم سب سے سوا
معراج میں کر لی سیر فلک دیکھا جو نہ دیکھے چشم ملک
یہ کس کو ملے ہیں جاہ و حشم،سب تم سے ہیں کم تم سب سے سوا
محبوب خدا کے روضے پر پڑھ چل کے نعیمؔ اپنی یہ غزل
کیا خوب دکھایا زور قلم، سب تم سے ہیں کم تم سب سے سوا

جاگتے رہو!

جناب گہرؔ جائسی

ایک دن پوچھا یہ مجھ سے دوست نے　　کس لئے یوں ذلت مذہب ہوئی
مختصر میں نے دیا اس کو جواب　　یہ نہ پوچھو کس لئے ؟ اور کب ہوئی
زندگی مرسلؐ کی تھی اک صبح امن　　چوریاں ہونے لگیں جب شب ہوئی

قصیدہ

درمدح امام جعفر صادق علیہ السلام

امتیاز الشعراء مولانا سید محمد جعفر قدسی جائسی

رنگ دنیا کا لئے آئی ہے دنیا میں بہار　حسن سبزے کا دکھاؤں میں کہ پھولوں کا نکھار

ٹھٹھ لگا ہے در میخانہ پہ میخواروں کا　مست ہاتھی کی طرح لو وہ اٹھا ابر بہار

ابر ہے دوش صبا پر کہ سبیل داور　اب کوئی آن میں پیاسے رہیں گے پھول نہ خار

پانی ہی پانی گھڑی بھر میں نظر آئے گا　لوگ دل کھول کے کھیلیں گے بط مے کا شکار

جس طرف دیکھئے گلزار نظر آتا ہے　باغ ہی پر نہیں موقوف تماشائے بہار

اپنی حالت پہ نظر رکھنے کی فرصت کس کو　نقد جس کو نہیں مقدور وہ پیتا ہے ادھار

آئے تھے صحبت رندانہ میں ناصح بنکر　شیخ جی کی بھی گرو ہونے لگی ہے دستار

بجلیاں کوندتی ہیں خیر ہو یا رب سب کی　اپنے دشمن کو بھی ہے ساتھ لئے ابر بہار

کرتی جاتی ہے جو اٹکھیلیاں گلشن میں صبا　فرش سبزہ پہ نگہ کو نہیں ملتا ہے قرار

خواب میں حسن کے انداز الٰہی توبہ　کیا قیامت ہو جو ہو جائے یہ فتنہ بیدار

عشق پیچاں کو ہے پھر زلف گرہ گیر کی یاد　پھر ہے سوسن کی زباں پر وہی دلکش گفتار

جانب دشت چلے جوش جنوں کے بندے　کانٹے چننے کہ نہ الجھے کہیں دامان بہار

یوں تو ہر ایک پہ ہے باد بہاری کا اثر　کم نہیں ہوتا مگر نرگس شہلا کا خمار

اس قدر جوش جنوں ہے کہ الٰہی توبہ　دامن اہل محبت میں نہیں ہے کوئی تار

دیکھنا ہو اثر سوز نہاں تو دیکھو　دشت میں آگ اگلتے ہیں درختانِ چنار

کہیں قدرت کے خزانوں میں بھی ہوتی ہے کمی　پھول برسائے نہ کیوں ڈالیوں سے باد بہار

آبلے ٹوٹ کے پاؤں کے یہ دیتے ہیں صدا　تشنہ کام اب کہیں رہنے کے نہیں دشت میں خار

جس طرف دیکھئے پانی ہی نظر آتا ہے　آج کیا آب رواں اوڑھ کے آئی ہے بہار

سبزہ رنگان چمن کا ہے لب نہر جماو　پھول بھی جن کی ادا پر ہوئے جاتے ہیں نثار

آمد آمد سے ہے جس گل کی زمانہ گلزار
اب ہے کھلنے کو وہی غنچۂ امید بہار

امتحاں گاہ محبت میں پھر آتا ہے نظر
ایک جانباز طلبگار رضائے دلدار

دل نے فیضان بہاری سے بھی رکھا محروم
دہر میں میرے سوا کوئی نہیں ہے بیمار

ہائے میں ہائے مرے دل کی پریشاں حالی
کوئی ہمدرد نہ میرا ہے نہ اس کا غمخوار

سرد آہیں نہ بھرو بستر غم سے اب اٹھو
گرم ہے آج مسیحائے زمن کا دربار

آج پیدا ہوا مطلوب رسول اکرمؐ
آج پیدا ہوا محبوب خدائے غفار

فخر عیسیٰؑ ۔شرف نوحؑ و خلیلؑ و موسیٰؑ
سایۂ ناز یداللہ ولیّ ستّار

رونق بزم جہاں تازگئی باغ بہشت
پھول گلزار نبیؐ کا چمن دیں کی بہار

کردگار شرف و اشرف خلق داور
مایہ دار کرم و اکرم اصحاب کبار

مصطفیؐ خُلق نبیؐ دبدبہ، احمدؐ تنویر
مرتضیٰؑ فیض، علیؑ مرتبہ، حیدرؑ کردار

چشمۂ جود و عطا عین کرم بحر سخا
صاحب لطف و وفا رحمت ربّ غفار

اہل عرفاں کا امام اہل یقیں کا مولا
اہل ایماں کا امیر اہل نظر کا سردار

پیروِ جادۂ سردار شہیدان وفا
زینت مسند سر خیل رسولان کبار

خسرو عالمیاں چارہ گر اہل جہاں
سرور کون و مکاں بادشہ عرش وقار

عالمِ علمِ خدا محرم اسرار خدا
مظہر شان خدا سرِّ خدائے غفار

راحت جان علیؑ نور نگاہ احمدؐ
قدر افزائے علو انجمن آرائے وقار

بزم افروز ہدیٰ شمع حریم عرفاں
مشعل راہ رضا نور خدائے دادار

رکن دیں اصل یقیں بدر دجیٰ شمس ضحیٰ
بوئے گل رنگ وفا روح چمن جان بہار

مژدہ عرفان کو ایمان کو پھر خوشخبری
روضۂ دین پیمبرؐ میں پھر آئی ہے بہار

گلشن دہر بھی کیوں آج نہ ہو رشک بہشت
آج آیا ہے زمانے میں جناں کا سردار

اپنی قدرت کا تماشا جو دکھانا چاہے
خار کو پھول کرے پھول کو فرمائے خار

پھر وہی پھول کھلا جو کہ ہے اللہ پسند
گلشن فاطمہ زہراؑ میں پھر آئی ہے بہار

مثل سجادؑ عبادت میں وحید آفاق
مثل شبیرؑ جوانان جناں کا سردار

نام جعفرؑ ہے تو کنیت ابو عبداللہ
لقب پاک ہے صادق کہ ہے سچی گفتار

ملّت جعفری اسلام حقیقی نہ ہو کیوں
خدمت دین میں شغل رہا لیل ونہار

تو ہے سر تا بقدم شکل رسولؐ مختار
شان اللہ صمد کا ہے تو ہی آئینہ دار

تو دل سیدۂ عالمیاں کا ہے سرور
تو ہے سردار جوانان جناں کا دلدار

تیرے اقوال میں کافر ہی کرے گا شبہ
تیری سچائی کا قائل ہے علیم اسرار

نور حق، خُلق نبیؐ، شان علیؑ، حُسن حسن
رونما تجھ سے ہے اے دونوں جہاں کے سردار

تو وہ بندہ ہے کہ ہے زہد میں آپ اپنی مثال
تو وہ بندہ ہے کہ ہے صبرو وفا جس کا شعار

دشمن جاں ترا بے وجہ جو منصور ہوا
ہو گیا زہر دغا تیرے لئے تیغ کی دھار

مدفن پاک ترا جنت فردوس بقیع
سجدہ گاہ ملک و مرجع ارباب وقار

صابروں نے بھی نہیں پائی ترے صبر کی حد
تیری تربت کے فدا تیری مصیبت کے نثار

تیرے احباب کی قسمت کا بھلا کیا کہنا
وہ ہیں اور گلشن فردوس معلّٰی کی بہار

دھوم کونین میں ہے تیری مسیحائی کی
تیرے دربار میں عیسیٰؑ بھی ہیں شکل بیمار

یا شہ عقدہ کشا، ابر کرم، بحر عطا
اک نظر لطف کی للّٰلہ سوئے قدسیؔ زار

تیری مدحت کے لئے خلق ہوا دنیا میں
تیری الفت کا ازل ہی میں کیا قول و قرار

عید کا دن ہے مجھے آج نہ رکھنا محروم
میں ترے لطف کے صدقے ترے بخشش کے نثار

خون دل روؤں کہاں تک میں بصد حسرت و یاس
اب مرے گلشن امید میں آجائے بہار

سوز غم حدّ بیاں سے ہے فزوں، ادرکنی
کار امروز بفردا پئے داور مگذار

رباعی

چھنگا صاحب حسینؔ جائسی

منکر ہو جہاں میں اس کا کیونکر کوئی
ڈھونڈے سے ملے نہ جس کا ہمسر کوئی
میزان خرد میں ہم نے تولا سو بار
لیکن نہ ملا نبیؐ سے بہتر کوئی

قطعہ

رضاؔ جائسی

کفر کی ظلمت کو کیا دنیا سے زائل کر دیا
قادر مطلق کا اک عالم کو قائل کر دیا
دولت دیں مفت ہاتھوں ہاتھ تم نے بانٹ کر
یا محمدؐ اپنے در کا سب کو سائل کر دیا